مطالعۂ قرآن

آیات قرآنی کا تذکیری مطالعہ

مولانا وحید الدین خاں

مطالعۂ قرآن

ایک آسمانی کتاب کا کسی انسان پر اترنا ایک انتہائی غیر معمولی واقعہ ہے۔ قدیم عرب میں یہ غیر معمولی واقعہ ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے فرشتہ جبرئیل کے ذریعہ قرآن کو مکہ کے محمد بن عبد اللہ بن عبد المطلب کے اوپر اتارا۔ قرآن کا یہ نزول تقریباً تئیس سال میں پورا ہوا۔ اس کا ابتدائی حصہ ۶۱۰ء میں مکہ میں اترا اور اس کا آخری حصہ ۶۳۲ء میں مدینہ میں نازل ہوا۔

دلائل قرآن

یہ قرآن کس طرح پیغمبر اسلام پر اترا۔ اس کا ذکر قرآن میں ان الفاظ میں آیا ہے: **وإنه لتنزيل رب العالمين نزل به الروح الامين على قلبك لتكون من المنذرين، بلسان عربي مبين، وإنه لفي زبر الاولين،** (الشعراء ۱۹۲۔۱۹۶) یعنی اور بے شک یہ خداوند عالم کا اتارا ہوا کلام ہے۔ اس کو امانت دار فرشتہ لے کر اترا ہے۔ تمہارے دل پر تاکہ تم ڈرانے والوں میں سے بنو۔ صاف عربی زبان میں اور اس کا ذکر اگلے لوگوں کی کتابوں میں ہے۔

نزول وحی (روح) کی مزید تفصیلات حدیث میں آئی ہیں۔ وحی کی حقیقت کے بارے میں عرب میں سوال کیا گیا تو قرآن میں اس کا جواب اس طرح دیا گیا: **ويسئلونك عن الروح، قل الروح من أمر ربى و مااوتيتم من العلم الا قليلاً** (بنی اسرائیل ۸۵) یعنی اور وہ تم سے روح کے متعلق پوچھتے ہیں۔ کہو کہ روح میرے رب کے حکم سے ہے۔ اور تم کو بہت تھوڑا علم دیا گیا ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ اس سوال کے سلسلے میں اصل مسئلہ اس کا براہِ راست جواب دینے کا نہیں ہے بلکہ خود سائل کی اپنی محدودیت کا ہے۔ کیوں کہ سائل اپنی فطری محدودیت کی بنا پر اس مسئلہ کو صرف جزئی طور پر ہی سمجھ سکتا ہے، وہ کلی معنی میں اس کی نوعیت کا احاطہ نہیں کر سکتا۔ یہ جواب عین سائنٹفک ہے۔ دنیا کی تمام چیزوں کے مطالعہ کے لئے سائنس میں عین یہی طریقہ اختیار کیا جاتا ہے۔ خود سائنسی تحقیق نے بتایا ہے کہ انسان اپنی پیدائشی محدودیت کی بنا پر کسی علم کا کلی احاطہ نہیں کر سکتا۔ اس لئے سائنس میں جزئی واقفیت ہی کی بنیاد پر تمام نظریات قائم کئے گئے ہیں۔ یہی

سائنسی طریقہ وحی کے بارے میں بھی انسان کو اختیار کرنا چاہئے۔

قرآن خدا کا کلام ہے، وہ پیغمبر اسلام کا اپنا کلام نہیں۔ اس کا ایک سادہ ثبوت قرآن و حدیث کی زبان کا فرق ہے۔ حدیث خود پیغمبر اسلام کا اپنا کلام ہے اور قرآن وہ خدائی کلام ہے جو فرشتہ کے ذریعہ پیغمبر کے اوپر اترا۔ جب دونوں کا تقابلی مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ حدیث کی زبان اور قرآن کی زبان کے درمیان واضح اور نمایاں فرق ہے۔ حدیث اپنی تمام خوبیوں کے باوجود ایک ''بشر'' کی زبان معلوم ہوتی ہے۔ اس کے برعکس قرآن اپنے غیر معمولی اسلوب کی بنا پر ایک برتر شاہانہ کلام دکھائی دیتا ہے۔ حدیث کی زبان اور قرآن کی زبان کا یہ فرق اتنا زیادہ نمایاں ہے کہ کوئی بھی عربی داں جو دونوں کو تقابلی طور پر پڑھے، وہ اس فرق کو محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ دونوں کا یہ فرق اپنے آپ میں اس بات کا ثبوت ہے کہ قرآن اللہ کا کلام ہے نہ کہ خود رسول کا اپنا کلام۔

دوسری چیز یہ کہ قرآن کے کلام میں معنوی اعتبار سے ایسے مختلف استثنائی پہلو ہیں جو کسی بھی انسان کے کلام میں پائے نہیں جاتے۔ ان میں سے ایک پہلو یہ ہے کہ قرآن میں فلکیات، طبیعیات، حیاتیات، ارضیات، نباتات، حیوانات، اور تاریخ، وغیرہ کے بارے میں ایسے بیانات ہیں جو ڈیڑھ ہزار سال پہلے کسی بھی انسان کو معلوم نہ تھے جب کہ قرآن نازل ہوا۔ یہ حقائق پہلی بار صرف انیسویں صدی اور بیسویں صدی میں انسان کے علم میں آئے۔ ان حوالوں کا استثنائی طور پر قرآن میں موجود ہونا اس بات کا قطعی ثبوت ہے کہ قرآن خداوند عالم الغیب کا کلام ہے۔ کوئی انسان اس قسم کی پیشگی اطلاع پر قادر نہیں ہو سکتا۔

اس نوعیت کی بہت سی مثالیں راقم الحروف نے اپنی کتابوں میں درج کی ہیں۔ مثال کے طور پر ملاحظہ ہو، عظمتِ قرآن، مذہب اور جدید چیلنج کا متعلق حصہ۔ اپنی تفسیر تذکیر القرآن میں بھی بعض آیات کی تشریح کے تحت راقم الحروف نے اس طرح کے کچھ حوالے شامل کئے ہیں۔

فرانس کے ڈاکٹر مورس بکائی (Maurice Bucaille) نے خاص اسی موضوع پر ایک کتاب فرانسیسی زبان میں لکھی ہے۔ اس کا ترجمہ مختلف زبانوں میں ہوا ہے۔ عربی ترجمہ کا نام یہ ہے:
القرآن الکریم والتوراۃ والانجیل والعلم (صفحات ۲۹۰) انگریزی ترجمہ کا ٹائٹل یہ ہے:

اس کتاب میں قرآن کے قدیم بیانات کا تقابل جدید سائنسی دریافتوں سے کیا گیا ہے۔ مصنف نے لکھا ہے کہ دونوں کے درمیان استثنائی طور پر کامل مطابقت کی توجیہہ اس کے سوا کچھ اور نہیں کی جاسکتی کہ قرآن کو خدا کا کلام مانا جائے۔ اس موضوع پر تفصیلی بحث کرتے ہوئے مصنف نے آخر میں لکھا ہے کہ ـــــ

> In view of the level of knowledge in Mohammad's day, it is inconcevable that many of the statements in the Qur'an which are connected with science could have been the work of a man. It is, more over, perfectly legitimate, not only to regard the Qur'an as the expression of a Revelation but also to award it a very spacial place, on account of the guarantee of authenticity it provides and the presencein it of scientific statements which, when studied today, appear as challenge to explanation in human terms.

جمع وتدوین

قرآن پرنٹنگ پریس سے پہلے کے زمانہ میں نازل ہوا۔ مگر اس کی حفاظت کے لئے غیر معمولی اہتمام کیا گیا۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ہر وقت کوئی نہ کوئی کاتب وحی رہتا تھا تاکہ جب بھی جبرئیل قرآن کا کوئی حصہ لے کر اتریں تو فوراً اس کو لکھ لیا جائے۔ یہ کتاب اس زمانے کے مستعمل کاغذوں پر ہوتی تھی۔ مثلاً جھلی وغیرہ۔ کتابت کا یہ اہتمام اتنا زیادہ تھا کہ ہجرت کے موقع پر پیغمبر اسلام اپنے صحابی ابو بکر صدیق کے ساتھ مکہ سے مدینہ کے لئے روانہ ہوئے تو اگرچہ یہ انتہائی ہنگامی سفر تھا لیکن اس کے باوجود حضرت ابو بکر صدیق جو ایک کاتب وحی بھی تھے، اپنے ساتھ کاغذ اور قلم بھی لئے ہوئے تھے تاکہ سفر کے دوران اگر قرآن کا کوئی حصہ اترے تو اس کو فوراً لکھ لیا جائے۔

قرآن کو محفوظ کرنے کا یہ اہتمام بیک وقت دو طریقوں سے جاری تھا۔ ایک، نزول کے بعد فوراً اس کو لکھ لینا۔ دوسرے، اس کو باقاعدہ یاد کر لینا۔ اس طرح ایک طرف تقریباً دو درجن کاتب

وحی کتابت کے عمل میں مصروف رہتے تھے۔اور دوسری طرف ہزاروں کی تعداد میں آپ کے ایسے اصحاب تھے جو قرآن کو لفظ بلفظ یاد کر لیتے تھے۔واضح ہو کہ دورِ پریس سے پہلے دنیا بھر میں چیزوں کو یاد رکھنے کا رواج تھا اس لئے کثرت استعمال کی بنا پر اس زمانہ کے لوگوں کے حافظے بہت اچھے ہوا کرتے تھے۔ مثال کے طور پر قدیم عرب میں ایسے ہزاروں لوگ تھے جن کو لمبے لمبے نسب نامے اور بڑے بڑے قصیدے زبانی یاد تھے۔اور وہ ان کو اپنے حافظہ کی مدد سے مجلسوں میں پڑھا کرتے تھے۔

اس طرح قرآن حسب موقع اترتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے کچھ پہلے مکمل ہو گیا۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی آخر عمر میں جب کہ قرآن کے تمام حصے اتر چکے تھے، خدا کے حکم سے جبرئیل آپ کے پاس آئے۔انھوں نے قرآن کے تمام نازل شدہ حصوں کو موجودہ مصحف کے مطابق ترتیب دیا۔اور پھر مکمل قرآن سورہ فاتحہ سے لے کر سورہ الناس تک سلسلہ وار پڑھ کر سنایا۔اور پھر اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پورے قرآن کو اسی طرح سلسلہ وار پڑھ کر سنایا۔اس طرح جبرئیل کے سامنے مکمل قرآن پڑھنے کا واقعہ دوبار ہوا۔ پہلے کو عرضۂ اولیٰ کہا جاتا ہے اور دوسری بار پڑھے جانے کو عرضۂ اخیرہ۔

۶۳۲ء میں پیغمبر اسلام ﷺ کی وفات ہوئی تو اس وقت قرآن ہر اعتبار سے محفوظ اور مکمل ہو چکا تھا۔ البتہ وہ ایک مجلد کتاب کی صورت میں اب تک جمع نہیں ہوا تھا۔ یہ آخری کام خلیفۂ اول ابو بکر صدیق کی ہدایت کے تحت انجام پایا۔ خلیفۂ اول نے اس مقصد کے لئے زید بن ثابت انصاری کو مقرر کیا جو اس خاص کام کے لئے صحابہ میں سب سے زیادہ اہل سمجھے جاتے تھے۔

حضرت زید بن ثابت نے اس کام کے لئے وہ آخری اہتمام کیا جو کسی انسان کے لئے ممکن ہو سکتا تھا۔ انھوں نے اعلان کیا کہ لوگوں کے پاس قرآن کے لکھے ہوئے جتنے اجزاء ہیں وہ سب کے سب لائے جائیں۔ چنانچہ سب کے سب کتابت شدہ اجزاء حضرت زید بن ثابت انصاری رضی اللہ عنہ کے حوالے کر دئے گئے۔وہ خود قرآن کے مکمل حافظ تھے۔ تاہم انہوں نے مزید احتیاط کے لئے کچھ اور حفاظ کو اپنی مدد کے لئے مقرر کیا۔

اب وہ عمل شروع ہوا جس کو ایک مستشرق نے بجا طور پر چیکنگ کا دہرا طریقہ (dub-

ble checking system) کا نام دیا ہے۔ یعنی ایک طرف قاری قرآن کے حصے پڑھتا تھا اور دوسری طرف اس پڑھے ہوئے حصے کی مطابقت تحریری ذخیرہ سے کی جاتی تھی۔ اور جب تحریر اور حافظہ دونوں ایک دوسرے کے مطابق ثابت ہو جاتے تھے تو اس کو اس زمانہ کے دستیاب کاغذ پر لکھ لیا جاتا تھا۔ اس طرح دہرا چیکنگ کے اصول کو اختیار کرتے ہوئے پورے قرآن کو از اول تا آخر ترتیب کے اس زمانہ کے قابل حصول کاغذ پر لکھا گیا۔ اور پھر اس کی سلائی کر کے اس کو ایک مجلد کتاب کی صورت دی گئی۔ چونکہ پہلا مصحف چوکور تھا اس لئے وہ رَبعہ کہا جانے لگا۔

اس ربعہ (مصحف اول) کو خلیفہ ابو بکر صدیق نے رسول ﷺ کی زوجہ حضرت حفصہ بن عمر کے پاس رکھوا دیا۔ یہ مصحف اول اسی حالت میں حضرت حفصہ کے پاس محفوظ رہا۔ یہاں تک کہ تیسرے خلیفہ حضرت عثمان بن عفان کا زمانہ آیا۔ انھوں نے اس مصحفِ اول کو حضرت حفصہ کے پاس سے منگوایا اور سرکاری اہتمام کے تحت اس کے متعدد نقلیں تیار کرائیں۔ اور پھر ان تیار شدہ سرکاری نسخوں کو مسلم دنیا کے بڑے بڑے شہروں میں بھیج دیا اور یہ حکم دیا کہ یہ مصاحف شہر کی جامع مسجدوں میں رکھے جائیں تاکہ لوگ اس سے استفادہ کر سکیں۔ اس کے بعد ہر شہر میں لوگ ان مصاحف کی مزید نقلیں تیار کرنے لگے۔ یہاں تک کہ قرآن کے ہزاروں صحیح نسخے ایشیاء سے لے کر افریقہ تک ہر ملک میں پھیل گئے۔

قرآن کی حفاظت اور اشاعت کی یہ تاریخ آگے بڑھتی رہی۔ اس میں مختلف پہلوؤں سے نسل در نسل لوگ حصہ لیتے رہے۔ مثال کے طور پر بنو امیہ کے حاکم حجاج بن یوسف الثقفی (وفات ۹۵ھ / ۷۱۴ء) کے زمانے تک قرآن میں اعراب نہیں ہوتا تھا۔ جس کی وجہ سے غیر عالم اس کو پڑھنے میں غلطی کرتا تھا۔ حجاج نے یہ کیا کہ پورے قرآن پر اعراب لگوائے۔ اس کے نتیجہ میں یہ امکان ختم ہو گیا کہ کوئی شخص قرآن کو پڑھنے میں ادائیگی کی غلطی کرے۔

اسی طرح قرآن کے قدیم نسخے ابتدائی خط میں لکھے جاتے تھے۔ اس خط کا اسلوب بالکل سادہ تھا۔ اس میں موجودہ تحریری حسن موجود نہ تھا۔ اس کمی کو عباسی دور کے خطاط ابن مقلہ (وفات ۹۴۰ء) نے پورا کیا۔ ابن مقلہ خطاطی کا خصوصی ذوق رکھتا تھا۔ اس نے لمبی مدت کے مشق اور تجربہ

کے بعد وہ خوبصورت عربی خط ایجاد کیا جس کو خطِ کوفی کہا جاتا ہے۔ موجودہ عربی خط اسی کی ایک ترقی یافتہ شکل ہے۔ اس طرح ابن مقلہ کی کوششوں نے قرآن کو حسن خط کے دور میں داخل کردیا۔

قرآن کی حفاظت کا یہ عمل مسلسل صدیوں تک جاری رہا۔ کچھ لوگ کامل اہتمام کے ساتھ قرآن کی نقلیں تیار کرتے اور اسی طرح کچھ لوگ کامل اہتمام کے ساتھ قرآن کو حفظ کرتے۔ کتابت اور حفظ کو ایک دوسرے سے چیک کرنے کا عمل بھی صدیوں تک جاری رہا۔ جب بھی کوئی شخص قرآن کا ایک نسخہ لکھ کر تیار کرتا تو کسی حافظ کو پڑھوا کر وہ اس کو چیک کرتا۔ اسی طرح جب کوئی شخص قرآن کا حفظ کرتا تو اس کے حفظ کو لکھے ہوئے قرآن سے چیک کیا جاتا۔ یہ عمل مسلسل جاری رہا۔ کچھ لوگوں نے فن قرأت ایجاد کیا۔ اس کے بعد ہر نسل میں ہزاروں لوگ اس عمل میں مشغول ہو گئے کہ وہ پیغمبر اور آپ کے اصحاب کے لہجہ اور قرأت کو اس کی سابقہ حالت میں محفوظ رکھیں۔

یہ حفاظت قرأت کا یہ اہتمام اتنے بڑے پیمانہ پر ہوا کہ آج جب ایک تربیت یافتہ قاری قرآن کی تلاوت کرتا ہے تو سننے والوں کو ایسا محوس ہوتا ہے جیسے کہ وہ رسول اور اصحابِ رسول کی قرأت کو سن رہے ہیں۔ اس طرح رسول اور اصحاب رسول کی قرأت تاریخ کے دوش پر سوار ہو کر نسل در نسل سفر کرتی رہی تا کہ ہر زمانہ کے لوگوں کو اس کی گونج اپنی اصل آواز میں سنائی دیتی رہے۔

قرآن کی حفاظت کا یہ عمل نسل در نسل جاری رہا، یہاں تک کہ وہ پرنٹنگ پریس اور رکارڈنگ کے دور میں پہنچ گیا۔ پرنٹنگ کی ایجاد نے قرآن کی کتابت کو ابدی طور پر محفوظ کردیا۔ اسی طرح ریکارڈنگ کی ایجاد قرآن کی اصل آواز کی حفاظت کی یقینی ضمانت بن گئی۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ قرآن کی انسانی حفاظت کے ساتھ اب اس کی پشت پر مشینی حفاظت کا اہتمام بھی شامل ہو گیا ہے۔ اس اہتمامِ مزید نے اب متنِ قرآن میں کسی بھی قسم کے بگاڑ کو عملاً ناممکن بنادیا ہے۔

عربی زبان

قرآن کی حفاظت کے ساتھ یہ بھی ضروری تھا کہ قرآن کی زبان عربی کو ہمیشہ کے لئے محفوظ رکھا جائے۔ یہ کام بھی امت کے علماء نے بہت بڑے پیمانہ پر انجام دیا۔ عربی زبان قرآن کے نزول کے وقت ہی ایک اعلیٰ زبان کی حیثیت رکھتی تھی تاہم فنی اعتبار سے اس کی تدوین نہیں ہوئی تھی۔

اس سلسلہ میں بہت سے لوگ اٹھے جنھوں نے نحو اور صرف اور لغت کے میدان میں غیر معمولی کام کیا۔ اور عربی زبان کو ایک مدون لغت کی حیثیت دے دی۔ قرآن کی زبان عربی کی حفاظت کا یہ کام اتنے بڑے پیمانہ پر ہوا کہ عربی زبان استثنائی طور پر آج بھی اسی ابتدائی حالت میں زندہ ہے جیسا کہ وہ قرآن کے نزول کے وقت تھی۔ چودہ سو سال کی طویل مدت کے باوجود اس کے اندر کوئی لغوی تبدیلی نہ ہو سکی۔ جب کہ اس مدت میں دنیا کی تمام زبانیں بالکل بدل چکی ہیں۔

مثال کے طور پر جیفرے چاسر (Geoffrey Chaucer) انگریزی زبان کا مشہور شاعر ہے۔ چاسر ۱۳۴۲ء میں لندن میں پیدا ہوا اور ۱۴۰۰ میں اس کی وفات ہوئی۔ اس کا زمانہ آج سے پانچ سو سال پہلے کا ہے۔ لیکن اس کی زبان موجودہ انگلش زبان سے اتنا زیادہ مختلف ہے کہ آج کا کوئی عام انگریزی داں اس کو نہیں سمجھ سکتا۔ اس کو صرف ڈکشنری اور مخصوص ماہرین کی شرح کی مدد سے سمجھا جا سکتا ہے۔ مگر قرآن کی زبان عربی کا معاملہ اس سے یکسر مختلف ہے۔ آج لکھی جانے والی عربی زبان عین وہی ہے جو نزول قرآن کے زمانے میں تھی۔ قرآن اور حدیث اور صحابہ کی زبان کو سمجھنا آج کے ایک عربی داں کے لئے اتنا ہی آسان ہے جتنا آج سے چودہ سو سال پہلے کے ایک عربی داں کے لئے ممکن اور آسان تھا۔

عربی زبان کا اس طرح استثنائی طور پر اپنی اصل ابتدائی حالت پر باقی اور زندہ رہنا محض اتفاقا نہیں تھا۔ اللہ تعالیٰ کی توفیق سے ہزاروں لوگ حفاظتِ زبان کے اس عمل میں لگے رہے۔ انھوں نے نحو اور صرف اور لغت اور دوسرے متعلق فنون میں غیر معمولی محنتیں کیں یہاں تک کہ ایک غیر مدون زبان کامل معنوں میں ایک مدون علمی زبان بن گئی۔ قرآنی زبان کو محفوظ کرنے کی یہ محنت کتنے بڑے پیمانہ پر کی گئی، اس کی صرف ایک مثال یہاں نقل کی جاتی ہے۔ ابو سعید الاصمعی ایک مشہور لغوی تھا۔ وہ ۱۲۲ھ میں بصرہ میں پیدا ہوا اور بصرہ ہی میں ۲۱۶ھ میں اس کی وفات ہوئی۔ الاصمعی کو اس بات کی دھن تھی کہ وہ عربی الفاظ کے وہ معانی دریافت کرے جو اصلی عرب باشندوں کے ذہن میں ہوتے ہیں۔ اس مقصد کے لئے وہ لمبی مدت تک عرب کے صحراؤں میں گھومتا رہا تا کہ عرب بدوؤں سے عربی کے بارے میں لسانی معلومات حاصل کرے۔ کیوں کہ یہ سمجھا جاتا ہے کہ عرب

بدوؤں میں عربی زبان اپنی اصل حالت میں محفوظ ہے۔

قرآن کی ایک آیت کے الفاظ یہ ہیں: **فدمدم علیهم ربهم بذنبهم فسواها** (الشمس ۱۴)
الاصمعی کو یہ فکر ہوئی کہ خالص عرب کس خاص مفہوم میں اور کس خاص موقع پر "دمدم" کا لفظ بولتے ہیں۔ اس دھن میں وہ عرب کے ایک بدو قبیلہ کے پاس گیا۔ وہ ایسا کر سکتا تھا کہ کسی بدو سے پوچھتا کہ تم لوگ دمدم کا لفظ کس معنیٰ میں بولتے ہو مگر اس نے اس پر قناعت نہیں کی۔ اس نے چاہا کہ کوئی ایسا موقع آئے جب کہ ایک بدو بے ساختہ طور پر خود سے دمدم کا لفظ بول پڑے۔ اس مقصد کے لئے وہ ایک خانہ بدوش بدو خاندان کے ساتھ شامل ہو گیا۔

تقریباً چھ مہینے گزر گئے لیکن بدو کی زبان سے دمدم کا لفظ اسے سنائی نہیں دیا۔ آخر کار ایک دن ایسا ہوا کہ ایک مقام پر خیمہ لگا ہوا تھا۔ اور وہاں دن کے کھانے کے لئے سالن پک رہا تھا۔ بدو مرد خیمے کے اندر تھا اور اس کی عورت باہر کچھ کام کر رہی تھی۔ الاصمعی بدو کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ سالن پکتے پکتے جب وہ لمحہ آیا کہ اس کی حرارت سوڈگری پر پہنچ گئی اور برتن کے اوپر رکھا ہوا ڈھکن بھاپ کی جوش سے اچھل پڑا تو بدو نے اپنی بیوی کو اس کی خبر دیتے ہوئے کہا: دمدمت۔ یہ سنتے ہی الاصمعی خیمے سے نکل کر یہ کہتا ہوا بھاگا کہ:

والله وجدتُ والله وجدتُ، "خدا کی قسم میں پا گیا خدا کی قسم میں پا گیا۔"

اس طرح کئی سو سال تک ہزاروں اہل علم محنت کرتے رہے۔ وہ مختلف پہلوؤں سے عربی زبان کی حفاظت اور تدوین میں مصروف رہے۔ اس کا نتیجہ آج ہم یہ دیکھ رہے ہیں کہ جس طرح قرآن اپنی اصل حالت میں کامل طور پر محفوظ ہے اسی طرح اس کی زبان عربی بھی کامل طور پر محفوظ ہے۔ زبان و ادب کی تاریخ میں یہ ایک انتہائی نادر استثناء ہے، اس کی کوئی دوسری مثال تاریخ میں موجود نہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو آج قرآن کو سمجھنا عام لوگوں کے لئے اسی طرح ناممکن ہو جاتا جس طرح دوسری مذہبی کتابوں کے ابتدائی نسخوں کو سمجھنا عام لوگوں کے لئے ناممکن ہو چکا ہے۔ دوسری تمام مذہبی کتابیں ترجموں کی مدد سے پڑھی جاتی ہیں۔ جب کہ قرآن کا مطالعہ آج بھی اس کی اصل زبان میں کیا جاتا ہے۔

تفسیر قرآن

قرآن میں مختلف انداز سے یہ بات کہی گئی ہے کہ قرآن کے نزول کا مقصد یہ ہے کہ لوگ اس پر غور کریں اور اس سے ہدایت حاصل کریں: **كتاب انزلنه اليك مبارك ليدبروا آيته وليتذكر اولوا الالباب** (صٓ ۲۹) یعنی یہ ایک بابرکت کتاب ہے جو ہم نے تمہاری طرف اتاری ہے تاکہ لوگ اس کی آیتوں پر غور کریں اور تاکہ عقل والے اس سے نصیحت حاصل کریں۔

قرآن کو پڑھنے کے دو طریقے ہیں۔ ایک ہے سادہ طور پر اس کی قرأت کرنا۔ اور دوسرا طریقہ یہ ہے کہ اس کی آیتوں میں غور و فکر کر کے اس کو پڑھا جائے۔ قرآن کی قرأت سے ایک شخص کو اس کے سادہ معانی معلوم ہو جاتے ہیں۔ اور اس طرح قرآن کو سادہ طور پر سمجھنا بھی بلاشبہہ مفید ہے۔ لیکن قرآن کے گہرے معانی صرف اس وقت سمجھ میں آسکتے ہیں جب کہ اس کی آیتوں پر غور و فکر کیا جائے۔ ایک صحابی کے متعلق، روایت میں آیا ہے کہ انہوں نے سورہ البقرہ کا مطالعہ غور و فکر کے ساتھ کیا تو اس میں انھیں تین سال کا وقت لگ گیا۔

قرآن کی سادہ قرأت کیا ہے، اس کو سمجھنا کوئی مشکل کام نہیں۔ ہر آدمی جو عربی زبان جانتا ہے وہ سادہ قرأت کے ذریعہ قرآن کے معانی کو سمجھ سکتا ہے اور جو شخص عربی زبان نہیں جانتا وہ اپنی معلوم زبان میں قرآن کا ترجمہ پڑھ کر اس کو سمجھ سکتا ہے۔

اس اعتبار سے قرآن ایک آسان کتاب ہے (القمر ۱۷) جس آدمی کے اندر نصیحت لینے کا ذہن ہو اور وہ نفسیاتی پیچیدگی میں مبتلا نہ ہو تو قرآن کی سادہ قرأت یا اس کا ترجمہ پڑھنا بھی اس کے لئے مفید ہو سکتا ہے۔ وہ سادہ قرأت کے ذریعہ بھی ایسی تذکیری باتیں پالے گا جو اس کی زندگی کو سدھارنے والی ہوں اور اس کے لئے اسلامی زندگی گزارنے میں مددگار بن جائیں۔

لیکن قرآن میں تدبر کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ سادہ قرأت اور تدبر کے ساتھ قرأت کے فرق کو ایک حدیث میں اس طرح بیان کیا گیا ہے: **"أنزل القرآن على سبعة احرف، لكل آية منها ظهر وبطن، ولكل حد مطلع"** (مشکاۃ المصابیح ۱/۸۰) قرآن سات حرفوں پر اتارا گیا۔ اس کی ہر آیت کا ایک ظاہر ہے اور ایک اس کا باطن ہے۔ اور ہر حد کا ایک مطلع ہے۔

مطلع عربی زبان میں دیکھنے یا جھانکنے کی جگہ کو کہتے ہیں اگر آپ زمین پر کھڑے ہو کر آس پاس کی چیزوں کو دیکھ رہے ہوں تو آپ کی حد نظر کم ہو گی اور آپ بہت تھوڑی چیزوں کو دیکھ پائیں گے۔ لیکن اگر آپ ایک ملٹی اسٹوری بلڈنگ کی بالائی چھت پر کھڑے ہوں تو بلند مطلع کی وجہ سے آپ کی حد نظر بہت بڑھ جائے گی۔ اور آپ زیادہ دور تک کی چیزوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھ سکیں گے۔

اس حدیث میں مطلع کے فرق کی مثال سے بتایا گیا ہے کہ قرآن کو اس کے ظاہری الفاظ کے اعتبار سے پڑھنے میں اور اس کے معنی پر غور کر کے پڑھنے میں کیا فرق ہے۔ وہ فرق یہ ہے کہ جو آدمی صرف ظاہری الفاظ کے دائرے میں قرآن کو پڑھ رہا ہو وہ گویا نیچے کے مطلع سے قرآن کے مضامین کو دیکھ رہا ہے۔ ایسا آدمی قرآن کے صرف سادہ مفہوم تک پہنچ سکے گا۔ اس کے برعکس جو آدمی معانی پر غور کرتے ہوئے قرآن کو پڑھے وہ گویا بلند مطلع سے قرآن کے مضامین کو دیکھ رہا ہے۔ یہ دوسرا آدمی قرآن کی گہرائیوں تک پہنچ جائے گا۔ قرآن کے مطالعہ کی ان دو مختلف قسموں کو علمی زبان میں اس طرح بھی بین کیا جاسکتا ہے کہ ان میں سے ایک قرآن کی سطور (lines) کا مطالعہ ہے اور دوسرا قرآن کے بین السطور (between the lines) کا مطالعہ۔ مطالعہ کی ان دونوں قسموں میں جو فرق ہے اس کو اہل علم بخوبی طور پر سمجھ سکتے ہیں۔

قرآن کے سطور کو پڑھنا اور قرآن کے بین السطور کا مطالعہ کرنا، دونوں میں جو فرق ہے اس کو یہاں مثال کے ذریعہ واضح کیا جاتا ہے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ عیہ وسلم جب مدینہ میں تھے تو وہاں ایسا ہوا کہ آپ کی مجلس میں بعض لوگ زور زور سے بولنے لگے۔ یہ اسلامی آداب کے خلاف تھا۔ چنانچہ قرآن میں اس کی ممانعت کے لئے یہ آیت اتری:

اے ایمان والو، تم اپنی آوازوں کو پیغمبر کی آواز سے اوپر مت کرو اور نہ اس کو اس طرح آواز دے کر پکارو جس طرح تم آپس میں ایک دوسرے کو پکارتے ہو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہارے اعمال حبط (برباد) ہو جائیں اور تم کو خبر بھی نہ ہو۔ جو لوگ اللہ کے رسول کے آگے اپنی آوازیں پست رکھتے

ہیں وہی وہ لوگ ہیں جن کے دلوں کو اللہ نے تقویٰ کے لئے جانچ لیا ہے۔ان کے لئے معافی ہے اور بڑا ثواب ہے۔ جو لوگ تم کو حجروں کے باہر سے پکارتے ہیں ان میں سے اکثر سمجھ نہیں رکھتے۔ اور اگر وہ صبر کرتے یہاں تک کہ تم خود ان کے پاس نکل کر آجاؤ تو یہ ان کے لئے بہتر ہوتا۔ اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔ (الحجرات ۲۔۵)

قرآن کی ان آیتوں کو جو آدمی سادہ طور پر محض الفاظ کی سطح پر پڑھے گا وہ اس کے ظاہری مفہوم کو لے کر اس سے صرف ذاتی تقدس کا مسئلہ نکالے گا۔ وہ سمجھے گا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بہت زیادہ مقدس تھی اس لئے جو لوگ آپ کی مجلسوں میں بیٹھتے تھے ان کو یہ حکم دیا گیا کہ وہ تقدس اور احترام کے آداب کو ملحوظ رکھتے ہوئے آپ کے پاس بیٹھیں۔ ایسا آدمی صرف قدیم مدینہ کے کچھ لوگوں کو اس کا مخاطب سمجھے گا۔ خود اپنی ذات کے لئے یا دوسروں کے لئے اس کے نزدیک اس میں کوئی ہدایت نہ ہوگی۔

اس کے برعکس جو آدمی حکم کی معنویت پر غور کرے گا اور زیادہ گہرے مفہوم تک پہنچنے کی کوشش کرے گا وہ ان آیتوں میں ایک عمومی اور ابدی مسئلہ دریافت کرلے گا۔ وہ سمجھے گا کہ زمانۂ رسالت میں اگر اس کا تعلق ذاتِ رسول سے تھا تو اب اس کا تعلق پیغام رسول سے ہو گیا ہے۔ جس طرح پیغمبر اسلام کی زندگی میں آپ کی آواز پر آواز بلند کرنا جائز نہیں تھا۔ اسی طرح آج یہ جائز نہیں ہے کہ کوئی آدمی پیغمبر اسلام کی دی ہوئی تعلیمات کے خلاف غیر ضروری بحثیں نکالے اور ان کے مقابلہ میں سرکشی کا مظاہرہ کرے۔

ایسے آدمی کو آیتوں کا پورا مطالعہ بتائے گا کہ ان آیات میں جس حقیقت کی نشاندہی کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ آدمی کی ایک روش وہ ہے جو ایمان اور تقویٰ اور صبر کے مطابق ہے۔ اور دوسری روش وہ ہے جو نفاق اور بے خوفی اور بے صبری کی علامت ہے۔ آدمی کو چاہئے کہ وہ ہر لمحہ اپنا احتساب کرے۔ وہ اپنے اندر ایمان والی صفات پیدا کرنے کی کوشش کرے اور نفاق والی صفتوں سے اپنے آپ کو آخری حد تک بچائے۔

اس معاملہ کی ایک اور مثال لیجئے۔ قرآن کی سورہ نمبر ۱۲ میں حضرت یوسف علیہ السلام کا

قصہ بیان ہوا ہے۔ اس کا ایک جزء یہ ہے کہ قحط کے زمانہ میں حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائی غلہ لینے کے لئے ان کے پاس مصر میں آئے جب ان کو غلہ دیا جا چکا تو اس کے بعد ایک واقعہ ہوا جو قرآن میں اس طرح بیان کیا گیا ہے:

پھر جب ان کا سامان تیار کرادیا تو اس نے پینے کا پیالہ (سقایہ) اپنے بھائی کے اسباب میں رکھ دیا۔ پھر ایک پکارنے والے نے پکارا کہ اے قافلہ والو، تم لوگ چور ہو، انھوں نے ان کی طرف متوجہ ہو کر کہا، تمہاری کیا چیز کھوئی گئی ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہم شاہی پیانہ (صواع) نہیں پار ہے ہیں۔ اور جو اس کو لائے گا اس کے لئے ایک بارِ شتر غلہ ہے اور میں اس کا ذمہ دار ہوں۔ انھوں نے کہا، خدا کی قسم تم کو معلوم ہے کہ ہم اس ملک میں فساد کرنے کے لئے نہیں آئے اور نہ ہم کبھی چور تھے۔ انھوں نے کہا اگر تم جھوٹے نکلے تو اس چوری کرنے والے کی سزا کیا ہے۔ انھوں نے کہا، اس کی سزا یہ ہے کہ وہ جس شخص کے اسباب میں ملے پس وہی شخص اپنی سزا ہے۔ ہم لوگ ظالموں کو ایسی ہی سزا دیا کرتے ہیں۔ پھر اس نے اس کے (چھوٹے) بھائی سے پہلے ان کے تھیلوں کی تلاشی لینا شروع کی۔ پھر اس کے بھائی کے تھیلے سے اس کو بر آمد کر لیا۔ اس طرح ہم نے یوسف کے لئے تدبیر کی۔ وہ بادشاہ کے قانون کی رو سے اپنے بھائی کو نہیں لے سکتا تھا مگر یہ کہ اللہ چاہے۔ ہم جس کے درجے بلند کرنا چاہتے ہیں بلند کر دیتے ہیں اور ہر علم سے بالاتر ایک علم والا ہے (یوسف ۷۰-۷۶)

ان آیتوں کو جو آدمی سادہ طور پر صرف الفاظ کی سطح پر پڑھے وہ اس کا مطلب یہ سمجھے گا کہ حضرت یوسف کے سوتیلے بھائیوں کے ساتھ جب ان کا سگا بھائی بن یامین آیا تو انھوں نے چاہا کہ اپنے بھائی کو اپنے پاس روک لیں۔ مگر وہ سوتیلے بھائیوں پر اپنی شخصیت ظاہر نہیں کرنا چاہتے تھے اس لئے حضرت یوسف نے اپنے چھوٹے بھائی کے سامان میں شاہی دربار کا ایک برتن رکھوادیا۔ اور اس کے بعد درباریوں کو اس میں شریک کر کے بن یامین کو چوری میں پکڑوا کر ان کو اپنے پاس رکھ لیا۔ اس قسم کا معاملہ بلاشبہہ ایک پیغمبر کی شان کے خلاف ہے۔ لیکن جو آدمی صرف لفظی سطح پر قرآن کا مطالعہ کرے وہ ان آیتوں کا یہی مطلب لے گا۔ لیکن جو آدمی قرآن کی سطور سے گزر کر بین السطور تک پہنچنے کی کوشش کرے گا اور گہرائی میں اتر کر اس کا مفہوم جاننا چاہے گا وہ مذکورہ تفسیر کے برعکس

ایک اور تفسیر تک پہنچ جائے گا جو پیغمبر کی شان کے عین مطابق ہے۔

ایسا آدمی جب قرآن کی ان آیتوں پر غور کرے گا تو اس کا ذہن ایک مقام پر پہنچ کر رک جائے گا۔ وہ دیکھے گا کہ شاہی دربار کے کارکن جو چیز تلاش کر رہے تھے وہ صواع (یوسف ۷۲) تھا جو عربی قاعدے کے مطابق مذکر ہے اور اس کے لئے ضمیر مذکر (ہ) آنا چاہئے۔ لیکن شاہی دربار کے کارکن اونٹوں کے سامان کی تلاشی لیتے ہیں تو سامان میں جو چیز ان کو ملتی ہے اس ملی ہوئی چیز کے لئے قرآن میں مونث کی ضمیر (ھا) استعمال ہوئی ہے (۷۶)

اب غور کرنے والا آدمی جب ضمیر کے اس فرق کو دیکھے گا تو وہ پائے گا کہ معاملہ کی اصل تصویر اس سے بالکل مختلف ہے جو ظاہری الفاظ میں دکھائی دیتی تھی۔ اس سراغ کی روشنی میں جب وہ مزید غور کرے گا تو اس پر منکشف ہوگا کہ معاملہ کی اصل تصویر یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے چھوٹے بھائی کو پہچان کر اپنا پانی پینے کا پیالہ (سقایہ) اس کے سامان میں رکھ دیا۔ سقایہ کا لفظ عربی قاعدے کے مطابق مؤنث ہے۔

دربار میں ناپ کے لئے ایک شاہی پیمانہ (صواع) تھا جو غالباً چاندی کا تھا۔ عربی قاعدے کے مطابق صواع کا لفظ مذکر ہے۔ اتفاق سے یہ صواع غلہ کے ڈھیر میں دب کر کہیں چھپ گیا۔ یعنی وہی واقعہ ہوا جس کو انگریزی میں مس پلیس (misplace) ہونا کہتے ہیں۔ قافلے کے جانے کے بعد جب دربار کے کارکنوں نے صواع کو نہیں دیکھا تو ان کو قافلہ والوں پر شبہہ ہوا جو ابھی ابھی دربار سے نکلے تھے۔ چنانچہ انھوں نے قافلہ والوں کو روک کر ان کے سامان کی تلاشی لی۔ اس تلاشی میں صواع تو ان کے سامان سے برآمد نہیں ہوا البتہ سقایہ (پینے کا پیانہ) برآمد ہو گیا۔ یہ بات اس طرح سے معلوم ہوتی ہے کہ تلاشی کے دوران جو چیز برآمد ہوئی اس کے لئے قرآن میں مونث کی ضمیر (ھا) آئی ہے۔ حالانکہ اگر صواع برآمد ہوتا تو اس کے لئے قرآن میں مذکر کی ضمیر (ہ) آنی چاہئے تھی۔

یہ سقایہ حضرت یوسف کے چھوٹے بھائی بن یامین کے سامان سے نکلا تھا کیوں کہ برادارنہ محبت کے تحت حضرت یوسف نے اس کو اپنے بھائی کے سامان میں رکھ دیا تھا۔ اب یہ ہوا کہ دربار کے کارکنوں نے جب بن یامین کے سامان سے سقایہ نکالا تو انہوں نے بھائیوں سے کہا کہ تم نے اگرچہ

صواع کی چوری تو نہیں کہ ہے، لیکن تم نے ہمارے دربار کے ایک اور سامان سقایہ کو چرایا ہے اس لئے خود تمہارے قانون کے مطابق ہم تمہارے بھائی کو روک لیں گے اور اس کو تمہارے ساتھ جانے نہیں دیں گے۔ اس کے بعد وہ بن یامین کو اپنے ساتھ لائے اور ان کو حضرت یوسف کے حوالے کر دیا۔

قرآن فہمی کے لئے بہت سے علوم ضروری ہیں جن کا ذکر اہل تفسیر نے کیا ہے۔ اس سلسلہ میں ایک قابل لحاظ بات یہ ہے کہ قرآن کے مطالعہ کے دو طریقے ہیں۔ ایک ہے فنی مطالعہ، اور دوسرا مطالعہ وہ ہے جو قرآن سے نصیحت لینے کے لئے کیا جائے۔ جہاں تک قرآن کے فنی مطالعہ کا تعلق ہے، اس کے سلسلہ میں بہت سے علوم کی ضرورت ہو سکتی ہے، حتی کہ ان علوم سے بھی زیادہ جن کا ذکر اہل تفسیر نے کیا ہے۔ اگر اس حدیث کو سامنے رکھا جائے: **لا تنقضی عجائبہ** (قرآن کے عجائب کبھی ختم نہ ہوں گے) تو یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ان علوم کی فہرست ہر دور میں بڑھتی رہے گی اور وہ کبھی ختم نہ ہوگی۔

مگر جہاں تک نصیحت کے مقصد سے قرآن کے مطالعہ کا تعلق ہے اس کے لئے عربی زبان سے واقفیت کے بعد سب سے زیادہ جس چیز کی ضرورت ہے وہ تقویٰ اور خشیت ہے۔ اس کی تصدیق خود قرآن سے ہوتی ہے۔ چنانچہ قرآن میں ارشاد ہوا ہے: **اتقوا اللہ ویعلمکم اللہ**۔ حقیقت یہ ہے کہ تقویٰ خود علوم ربانی کا ایک عظیم سرچشمہ ہے۔ اگر آدمی کے اندر گہرا تقویٰ موجود ہو تو قرآن کے معانی کو سمجھنے میں وہ اپنے آپ آدمی کے لئے مکمل رہنما بن جائے گا۔

تقویٰ آدمی کے اندر سنجیدگی پیدا کرتا ہے۔ ایسا آدمی رائے قائم کرنے میں بے حد محتاط ہو جاتا ہے۔ وہ حقیقتوں کو اللہ کی نظر سے دیکھنے کا حریص بن جاتا ہے نہ کہ محض اپنی نظر سے۔ وہ رائے قائم کرنے سے پہلے مطالعہ اور فکر کی تمام ممکن شرطوں کو پورا کرنا چاہتا ہے۔ یہ چیزیں آدمی کو اس قابل بنا دیتی ہیں کہ وہ صراط مستقیم سے بھٹکے بغیر قرآن کے معانی کا ادراک کر سکے۔

اسبابِ نزول کی روایات

قرآنی آیتوں کے سلسلہ میں اسباب نزول کی جو روایات ہیں وہ قرآن فہمی کے معاملہ میں

بے حد اہمیت رکھتی ہیں۔ ان سے مختلف احکام کے نزول کا پس منظر معلوم ہوتا ہے۔ اور یہ ایک حقیقت ہے کہ پس منظر کو جانے بغیر کسی کلام کو درست طور پر سمجھا نہیں جاسکتا۔

اس معاملہ کی اہمیت کو سمجھنے کے لئے ایک مثال لیجئے۔ راقم الحروف کی تحریریں مسلسل طور پر انٹرنٹ پر آرہی ہیں۔ جون ۲۰۰۰ میں میرے کچھ مضامین انٹرنٹ پر آئے جن میں موجودہ مسلمانوں کو قرآن کی روشنی میں یہ مشورہ دیا گیا تھا کہ وہ صبر واعراض کی روش اختیار کرتے ہوئے دعوت کا کام کریں۔ اس کے بعد مجھے ایک ''مسلم مجاہد'' کا انٹرنٹ پر شدید رد عمل ملا۔ انہوں نے غصہ کے انداز میں کہا تھا کہ دیکھو، یہ ہندستانی مولانا ہم سے کہتا ہے کہ تم لوگ صبر کرو۔ جب کہ قرآن کہہ رہا ہے کہ تم لوگ جنگ کرو (قاتلوا ائمة الکفر الخ)۔ التوبۃ ۱۲۔۱۳

اس کے جواب میں میں نے مذکورہ مجاہد بھائی کو لکھا کہ میں نے جو باتیں لکھی ہیں وہ اپنی طرف سے نہیں لکھی ہیں بلکہ ان کے لئے خود قرآن کے حوالے دئے ہیں۔ پھر میں نے بتایا کہ اصل مسئلہ کیا ہے۔ اس کی وضاحت کرتے ہوئے میں نے لکھا کہ آج جس طرح قرآن آپ کے ہاتھ میں ایک مجلد کتاب کی صورت میں ہے، اسی طرح اگر وہ اول دن سے موجود ہوتا تو یہی صورت حال غالباً دور اول میں بھی پیش آتی۔

چنانچہ مکہ میں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ کہتے کہ اے مسلمانو، صبر کرو تو آپ جیسے کوئی صاحب قرآن کی ایک جلد لے کر کھڑے ہوتے اور کہتے کہ دیکھو، محمد ہم کو صبر کی نصیحت کررہے ہیں اور قرآن صاف لفظوں میں کہہ رہا ہے کہ ظالموں سے جنگ کرو، (الحج ۳۹)۔ اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب حدیبیہ میں قریش کے مشرک لیڈروں سے صلح کررہے تھے تو وہاں بھی کوئی صاحب مکمل قرآن اپنے ہاتھ میں لے کر کہتے کہ دیکھو، محمد ہم سے کہتے ہیں کہ کافروں سے صلح کرلو جب کہ قرآن برعکس طور پر یہ کہہ رہا ہے کہ ان سے جنگ کرکے ان کا فتنہ ختم کرو۔ (الانفال ۳۹)

دور اول میں اس قسم کا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا پھر موجودہ زمانہ میں کیوں ایسا ہورہا ہے۔ اس عجیب صورت حال کی وجہ یہ ہے کہ اسلام کے ابتدائی دور میں اور بعد کے زمانہ میں ایک بنیادی فرق

ہے۔ جیسا کہ معلوم ہے، قرآن نجماً نجماً ۲۳ سال کی مدت میں اترا۔ مکہ میں ابتداءِ رسالت سے لے کر مدینہ میں آپ کی وفات تک مختلف اور متنوع قسم کے حالات پیش آتے رہے۔ چنانچہ حالات کی نسبت سے اس وقت جو ہدایت مطلوب ہوتی وہ قرآن میں بروقت نازل کر دی جاتی۔ یہی وہ بات ہے جو قرآن کی اس آیت میں کہی گئی ہے: **و قرآناً فرقنه لتقرأه علی الناس علی مکث ونزلنه تنزیلاً** (بنی اسرائیل ۱۰۶)

گویا دور اول میں یہ صورت حال تھی کہ جب اور جس وقت جو عمل مطلوب ہوتا اس سے مطابقت رکھنے والی آیت پیغمبر اسلام ﷺ کے پاس بھیج دی جاتی۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ اس وقت نزول حکم اور اس کے عملی انطباق کے درمیان کوئی فرق یا فاصلہ موجود نہ تھا۔

مگر اس کے بعد یہ ہوا کہ ۲۳ سال میں وقفہ وقفہ سے اتری ہوئی آیتیں اور سورتیں ایک واحد کتاب کی شکل میں مرتب کر کے بیک وقت اہل اسلام کو دے دی گئیں۔ اب یہی کامل نسخہ بعد کے مسلمانوں کے پاس ہے۔

اب یہ سوال ہے کہ حکم اور انطباق کے درمیان فرق کے اس مسئلہ کو کس طرح حل کیا جائے۔

اسباب نزول یا شان نزول کی روایات اسی کا جواب ہیں۔ اب ہمیں یہ کرنا ہے کہ اسباب نزول کی روشنی میں آیتوں کا مطالعہ کر کے اس مخصوص حالت یا پس منظر (background) کو دریافت کریں جو آیت کے ابتدائی نزول کے وقت مکہ اور مدینہ میں موجود تھا۔ اور پھر قدیم حالت اور موجودہ حالت کے درمیان مشابہت (similarity) کو دریافت کر کے یہ سمجھے کہ کس طرح کی صورت حال میں کون سی آیت قابل انطباق (applicable) ہے اور کون سی آیت قابل انطباق نہیں۔

اسی حکمت تشریع کی روشنی میں فقہ کا یہ اصول وضع ہوا ہے کہ **تتغیر الاحکام بتغیر الزمان والمکان**، یعنی دوسرے لفظوں میں یہ کہ احکام کے انطباق کا تعین خود حالات کی نوعیت سے ہوتا ہے نہ کہ محض حکم کے الفاظ سے۔

یہ ایک بے حد اہم بات ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ طریقہ درست نہیں کہ آدمی قرآن کی ایک آیت لے کر کہے کہ دیکھو قرآن میں یہ حکم موجود ہے اور ہمیں اس پر عمل کرنا ہے۔

اس کے بجائے یہ ہونا چاہئے کہ پہلے کسی وقت میں موجود صورت حال(given situation) کو بے لاگ طور پر سمجھا جائے اور پھر یہ معلوم کیا جائے کہ اس طرح کی صورت حال میں قرآن کا کون سا حکم قابل انطباق(applicable) ہے۔

خلیفۂ چہارم علی بن ابی طالب کے زمانہ میں کچھ لوگوں نے قرآن کی بعض آیتوں کو مطلق طور پر لے کر ان کے انطباق کا مطالبہ کیا جب کہ وہ آیتیں صورتِ موجودہ کے لئے نہ تھیں۔ ایسے لوگوں کے خلاف سخت تبصرہ کرتے ہوئے خلیفۂ چہارم نے کہا: **كلمة حق اريد بها الباطل**۔ یعنی بظاہر یہ لوگ قرآن کی آیتوں کا حوالہ دے رہے ہیں مگر وہ ان آیتوں کو غلط جگہ چسپاں کرنا چاہتے ہیں۔ اس لئے بظاہر اگر چہ وہ کلمۂ حق پیش کررہے ہیں مگر وہ سراسر باطل پر ہیں۔

معلوم ہوا کہ کسی عمل کے قرآنی ہونے کے لئے یہ کافی نہیں ہے کہ اس کی حمایت میں آدمی نے ایک قرآنی آیت کو پالیا ہو۔ بلکہ لازمی طور پر یہ بھی ضروری ہے کہ وہ آیت اسی خاص موقع کے لئے ہو جہاں اس کو استعمال کیا جارہا ہے۔ بصورت دیگر ایسا فعل ایک سرکشی ہوگا نہ کہ قرآن کا اتباع۔

فہم قرآن کی کلید

"فہم قرآن کی کلید کیا ہے"۔ اس سوال کے مختلف جوابات دئے گئے ہیں۔ مثلاً ایک جواب یہ ہے کہ قاری قرآن کی اس انقلابی اسکیم کو جانتا ہو جو قرآن کا اصل مقصود ہے۔ مگر یہ ایک ایسا جواب ہے جس کا ماخذ خود قرآن میں موجود نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ محض اپنے ذاتی ذہن کے تحت اس سوال کا جواب متعین نہیں کیا جاسکتا۔ ہم قرآن میں ایسی کوئی آیت نہیں پاتے جس میں یہ کہا گیا ہو کہ قرآن کو صرف وہ شخص سمجھے گا جو قرآن کی انقلابی اسکیم سے واقف ہو۔ ایسی حالت میں یہ جواب قابل قبول نہیں ہوسکتا۔ وہ اس قابل ہے کہ پہلے مرحلہ ہی میں اس کو رد کردیا جائے۔

اسی طرح کچھ لوگوں کا یہ کہنا ہے کہ "نظم کلام" وہ کلید ہے جس کے ذریعہ ہم قرآن کو سمجھ سکتے ہیں۔ مگر یہ جواب بھی درست نہیں۔ کیوں کہ وہ بھی صرف ذاتی سوچ (reasoning) پر مبنی ہے۔ قرآن میں ایسی کوئی آیت موجود نہیں جو یہ اعلان کرتی ہو کہ نظم کلام کا سمجھنا قرآن فہمی کی کلید ہے۔ ایسی حالت میں اس کو بھی زیر غور نہیں لایا جاسکتا۔ یہ زیادہ سے زیادہ ایک استنباطی قرینہ ہے، وہ کوئی منصوص

قرینہ نہیں۔ اور اس اہم سوال کا جواب پانے کے لئے قرآنی نص درکار ہے نہ کہ کسی کا ذاتی استنباط۔

اس پہلو سے جب ہم قرآن کو دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ قرآن میں اس کا جواب نہایت واضح لفظوں میں موجود ہے۔ مثلاً قرآن کے آغاز ہی میں یہ آیت ہمیں ملتی ہے کہ: **ذالك الكتاب لاريب فيه، هدى للمتقين**۔ (البقرہ ۲) اس آیت سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ قرآن سے رہنمائی لینے کے لئے جو اصل چیز مطلوب ہے وہ تقویٰ ہے۔ اسی طرح قرآن میں ارشاد ہوا ہے: **اتقوا الله ويعلمكم الله** (البقرہ ۲۸۲) اس آیت سے بھی واضح طور پر یہ بات نکلتی ہے کہ علم ربانی یا فہم قرآنی کی اصل کلید یہ ہے آدمی کے اندر تقویٰ کی صفت موجود ہو۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ تقویٰ کس طرح فہم قرآن کی کلید ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن جیسے کلام کو سمجھنے کے لئے اصل اہمیت یہ ہے کہ آدمی کے اندر سنجیدگی ہو۔ اس کے اندر کامل اعتراف کا جذبہ پایا جاتا ہو۔ وہ ہر قسم کے تعصبات سے خالی ہو کر قرآن کا مطالعہ کرے۔ وہ قرآن کو خود قرآن کی نظر سے دیکھے نہ کہ کسی اور نظر سے۔ وہ پورے معنوں میں حق کا متلاشی ہو۔ وہ قرآن میں خود قرآن کی بات جاننے کی کوشش کرے نہ کہ خود اپنی بات کو قرآن سے نکالنے کی کوشش کرنے لگے۔ وہ کھلے ذہن کے تحت قرآن کا مطالعہ کرے نہ کہ متاثر ذہن (conditioned mind) کے تحت۔

حقیقی تقویٰ آدمی کے اندر یہی صفات پیدا کرتا ہے۔ تقویٰ اس گہری اور ذہنی اور قلبی کیفیت کا نام ہے جو اس آدمی کے اندر پیدا ہوتی ہے جو اللہ کو اس کی عظمت و جلال کے ساتھ دریافت کرے۔ ایسا شخص انسان اصلی (man cut to size) بن جاتا ہے۔ اس کے اندر آخری حد تک فروتنی (modesty) کی صفت پیدا ہو جاتی ہے۔ اور بلاشبہہ یہی وہ نفسیات ہے جو آدمی کو اس قابل بناتی ہے کہ وہ حقائق و معارف کا ادراک کر سکے۔ قرآن فہمی کی دوسری تمام شرائط کی حیثیت اضافی ہے اور اس متقیانہ مزاج یا ربّانی نفسیات کی حیثیت اصلی۔

قرآن معرفتِ حق کی کتاب ہے۔ قرآن کا حقیقی مطالعہ وہ ہے جو اس کا عارفانہ مطالعہ ہو۔ فنی مطالعہ قرآن کا حقیقی مطالعہ نہیں۔

زیر نظر کتاب کی ترتیب

زیر نظر مجموعہ (مطالعۂ قرآن) کی ترتیب یہ ہے کہ اس میں قرآن کی تمام کی تمام ۱۱۴ سورتوں سے کچھ نہ کچھ آیات لی گئی ہیں۔ آیات کے معاملہ میں انتخاب کا طریقہ اختیار کیا گیا ہے۔ مگر سورتوں کے معاملہ میں نہیں۔

مجموعی طور پر اس کتاب کے کل ۲۵۴ اجزاء ہیں۔ قارئین کی سہولت کے لئے ہر جزء یا مضمون(item) کو اس طرح درج کیا گیا ہے کہ اس کے اوپر پہلے سورہ نمبر اور سلسلہ نمبر ہوتا ہے اور پھر اس کے نیچے زیر تشریح آیت کا عنوان۔اسی کے ساتھ ہر حوالہ کا آیت نمبر بھی ترجمہ کے آخر میں درج کیا گیا ہے۔اس طرح قاری کے لئے یہ ممکن ہو جاتا ہے کہ وہ اس کے جس جزء کے بارے میں مزید تحقیق چاہے،فوراً اس کو قرآن میں یا تفسیر قرآن میں نکال لے۔

وحیدالدین

نئی دہلی،۱۷؍جولائی ۲۰۰۰

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کا جملہ قرآن میں ۱۱۴ بار آیا ہے۔ وہ سورۃ التوبہ کے سوا ہر سورہ کے آغاز میں موجود ہے، اور سورہ النمل (آیت ۳۰) میں ایک بار آیا ہے۔ اس غیر معمولی تکرار سے اس کی اہمیت معلوم ہوتی ہے۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کا مطلب ہے —— میں شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان، نہایت رحم کرنے والا ہے۔

آدمی جب کسی کام کو شروع کرتا ہے تو وہ اس کو کسی نہ کسی بھروسہ پر شروع کرتا ہے۔ مثلاً ذہنی یا جسمانی طاقت، مال و دولت، اعوان و انصار، حالات و اسباب، وغیرہ۔ یہ سب کام شروع کرنے کے غیر مومنانہ طریقے ہیں۔ کسی کام کو شروع کرنے کا مومنانہ طریقہ یہ ہے کہ اس کو اللہ کے بھروسے پر شروع کیا جائے۔ آدمی جب کوئی کام شروع کرے تو اس کا سینہ ربانی جذبات سے بھرا ہوا ہو۔

بندے کے لئے کسی کام کا سب سے بہتر آغاز یہ ہے کہ وہ اپنے کام کو اپنے رب کے نام سے شروع کرے۔ وہ ہستی جو تمام رحمتوں کا خزانہ ہے اور جس کی رحمتیں ہر وقت ابلتی رہتی ہیں۔ اس کے نام سے کسی کام کا آغاز کرنا گویا اس سے یہ دعا کرنا ہے کہ تو اپنی بے پایاں رحمتوں کے ساتھ میری مدد کے لئے آجا۔ اور میرے کام کو خیر و خوبی کے ساتھ مکمل کر دے۔ یہ بندے کی طرف سے اپنی بندگی کا اعتراف ہے اور اسی کے ساتھ اس کی کامیابی کی الٰہی ضمانت بھی۔

قرآن کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ مؤمن کے قلبی احساسات کے لئے صحیح ترین الفاظ مہیا کرتا ہے۔ بسم اللہ اسی نوعیت کا ایک دعائیہ کلمہ ہے۔

حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **کل أمر ذی بال لم یبدأ فیه بسم الله الرحمن الرحیم اقطع**۔ (التفسیر المظہری، ۱/۲) یعنی ہر قابل اہتمام اُمر جس کو بسم اللہ الرحمین الرحیم سے شروع نہ کیا جائے وہ مقطوع ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس دنیا میں کوئی بھی کام صرف اس وقت اپنی تکمیل تک پہنچتا ہے جب کہ اس کو خدائی نظام کی مساعدت

حاصل ہو جائے۔ کسی کام کو بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے شروع کرنا گویا یہ کہنا ہے کہ خدایا میں نے اپنی کوشش سے ایک کام کا آغاز کیا ہے اب تو اپنی مدد سے اس کو آخری تکمیل تک پہنچادے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کوئی پر اسرار کلمہ نہیں ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ان مخصوص حروف اور الفاظ میں کوئی طلسماتی تاثیر چھپی ہوئی ہے اور جب ایک شخص اس کو اپنی زبان سے صحیح تلفظ کے ساتھ ادا کرتا ہے تو وہ پراسرار طور اپنا کام شروع کر دیتا ہے۔ بلکہ یہ الفاظ اس انسان کے اعلیٰ جذبات و کیفیات کی علامت ہیں جو خدا کو معرفت کے درجہ میں پائے ہوئے ہو۔ جس کا یقین ہو کہ خدا قادر مطلق ہے، اسی کی مدد سے ہوگا جو کچھ ہوگا، اس کی مدد کے بغیر اس دنیا میں کچھ بھی ہونے والا نہیں۔ یہ احساس جب لفظوں کی صورت میں ڈھل جائے تو اسی کا نام بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کہنا ہے۔

اس کلمہ میں خاص طور پر اللہ کی صفت رحمت کا ذکر ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ انسان کی نسبت سے اسی صفت کی سب سے زیادہ اہمیت ہے۔ اللہ کی یہی صفت ہے جس کی بنا پر آدمی اس کے اعلیٰ عطیات اور انعامات کا مستحق بنتا ہے۔ اللہ کا ہر چیز پر قادر ہونا اس کے ذاتی کمال کا مظہر ہے، اور اس کا رحمٰن ورحیم ہونا اس کا متقاضی ہے کہ وہ اپنی قدرت کے خزانوں میں انسان کو حصہ دار بنائے۔

انسان مکمل طور پر ایک عاجز مخلوق ہے۔ ایک خود شناس انسان جب بھی کسی عمل کا آغاز کرتا ہے، خواہ وہ چھوٹا ہو یا بڑا، تو اس وقت فطری طور پر اس کو محسوس ہوتا ہے کہ کوئی برتر ہستی ہو جو اس کے عجز کی تلافی کرے۔ جو کام وہ خود اپنی طاقت سے نہیں کر سکتا اس کو وہ اپنی برتر مدد کے ذریعہ مکمل کرے۔ یہی فطری احساس ہے جو ہر کام کے آغاز میں ایک خود شناس انسان کی زبان پر بار بار جاری ہوتا رہتا ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ایک جامع کلمہ ہے۔ وہ دعا بھی ہے اور ذکر بھی ہے، اور خدا کی عظمت اور اس کے مقابلے میں انسان کی عبدیت کی یاد دہانی بھی۔

1-002

حمد خداوندی

قرآن کی پہلی سورۃ کی پہلی آیت یہ ہے: الحمد للہ رب العالمین (الفاتحہ ۱) یعنی حمد سب کی سب صرف اللہ کے لئے ہے، جو سارے جہاں کا رب ہے۔ قرآن کی یہ آیت قرآن کی نسبت سے اس کی تعلیمات کا خلاصہ ہے، اور انسان کی نسبت سے اس کی فطرت کی بے ساختہ پکار۔

حمد کا لفظ اس لطیف احساس کے لئے بولا جاتا ہے جو آدمی کے اندر سے خدا کی تعریف اور اس کے شکر کے لئے فطری طور پر ابلتا ہے۔ آدمی کا اپنا وجود اور گردوپیش کی پوری کائنات ہر لمحہ اس کو یہ پیغام دے رہی ہے کہ تمہارا اور کائنات کا خالق ایک انتہائی عظیم ہستی ہے اور تمہارے اوپر اس ہستی کے عظیم احسانات ہیں۔ یہ گہرا شعور جب آدمی کے اندر پیدا ہو اور اس کا بے تابانہ اعتراف اس کی زبان سے ابل پڑے تو اسی کا نام حمد ہے جو بیک وقت تعریف کا پہلو بھی لئے ہوئے ہے اور شکر کا پہلو بھی۔

آدمی جب اپنے آپ پر غور کرتا ہے تو اس کو محسوس ہوتا ہے کہ اس کو ایک ایسا وجود دیا گیا ہے جو حیرت ناک حد تک کامل اور بامعنی ہے۔ وہ جب اپنے پاؤں سے چلتا ہے اور اپنے ہاتھ سے پکڑتا ہے تو اس کو محسوس ہوتا ہے کہ یہ ہاتھ اور یہ پاؤں اس کے لئے اتنی بڑی نعمت ہیں کہ ان کے بغیر وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ وہ جب آنکھ سے دیکھتا ہے اور کان سے سنتا ہے تو اس کے اندر ایک ایسا پرارتعاش جذبہ (thrill) پیدا ہوتا ہے جس کا اظہار لفظوں میں کیا جانا ممکن نہیں۔ وہ جب اپنے دماغ کو دیکھتا ہے اور اس کو استعمال کرتا ہے تو اس ناقابل بیان نعمت کے اعتراف میں اس کا سینہ جذبات سے بھر جاتا ہے۔ اسی قسم کی قلبی کیفیات کے لفظی اظہار کا نام حمد ہے۔

حمد ایک ایسا تجربہ ہے جو ہر آدمی کے ساتھ اور ہر وقت جاری رہتا ہے۔ وہ رات کو تھک کر بستر پر سو جاتا ہے اور صبح کو تازہ دم ہو کر اٹھتا ہے تو وہ خدا کی حمد میں سرشار ہو جاتا ہے۔ کیوں کہ یہ دراصل خدا ہی تھا جس نے رات کے وقت اس پر نیند طاری کی اور صبح کے وقت اس کو جگا

دیا۔اس کہ بعد جب وہ زمین پر چلتا ہے تو یہ چلنا اس کو ایک معجزاتی حد تک قابل شکر واقعہ معلوم ہو تا ہے۔ کیوں کہ زمین پر انسان کا چلنا کوئی سادہ بات نہیں، بے شمار فوق الطبیعی اسباب یکجا ہو تے ہیں،اس کے بعد یہ ممکن ہو تا ہے کہ انسان جیسی ایک مخلوق زمین پر چلے۔ مثال کے طور پر اگر زمین کا سائز موجودہ سائز کا دگنا ہو تو اس کی بڑھی ہوئی کشش کی بنا پر انسان کا جسم اتنا زیادی وزنی ہو جائے گا کہ زمین پر چلنا اس کو ایسا محسوس ہو گا کہ جیسے وہ اپنے سر پر کئی ٹن کا بوجھ لادے ہوئے ہے۔اسی طرح اگر زمین کا سائز موجودہ سائز کے مقابلے میں آدھا ہو جائے تو اس کی کشش گھٹ جانے کی وجہ سے انسان کا جسم اتنا زیادہ ہلکا ہو جائے گا کہ وہ زمین پر لڑکھڑانے لگے،اس کے لئے یہ نا ممکن ہو جائے گا کہ وہ قدم جما کر زمین پر چل سکے۔

اسی طرح آدمی جب سورج کی روشنی کو دیکھتا ہے اور اس سے فائدہ اٹھاتا ہے تو وہ سورج کی تخلیق اور اس کے نظام میں پوشیدہ ان گنت حکمتوں کو سوچ کر ہیبت زدہ ہو جاتا ہے۔ سورج کی شکل میں وہ ایسی خدائی نعمت کو دیکھنے لگتا ہے جس کے اظہار سے اس کی زبان عاجز ہے۔ سورج کی شکل میں خدا نے انسان کو جو نعمت دی ہے اس کے انگنت پہلو ہیں۔ مثال کے طور پر زمین کے مقابلے میں سورج کا فاصلہ بے حد موزوں ہے۔ اگر یہ فاصلہ کم ہو کر نصف ہو جائے تو زمین پر گرمی اتنی زیادہ بڑھ جائے گی کہ اس کی گرمی میں انسان اس طرح جھلس اٹھے گا جیسے جلتے ہوئے توے پر ایک کاغذ رکھ دیا جائے۔اس کے بر عکس اگر زمین سے سورج کا فاصلہ موجودہ فاصلہ کا دگنا ہو جائے تو زمین کی سطح پر اتنی ٹھنڈک ہو گی کہ انسان اس کے اندر ٹھٹھر کر رہ جائے۔

اسی طرح آدمی جب ہوا میں سانس لیتا ہے تو وہ اس کی حکمتوں کو سوچ کر حیرت زدہ رہ جاتا ہے۔ کس طرح یہ ممکن ہوا کہ مختلف گیسوں کا متناسب مجموعہ ہوا کی شکل اختیار کرے۔اس میں مخصوص تناسب کے ساتھ آکسیجن موجود ہو اور اس کے ساتھ درختوں کے ذریعہ آکسیجن کی سپلائی مسلسل جاری ہو۔اور پھر یہ ہوا آکسیجن کو لے کر ساری دنیا میں اس کی سپلائی کرے تا کہ کوئی انسان جہاں بھی ہو وہاں سانس لے کر زندہ رہ سکے۔اسی کے ساتھ انسانی جسم کے اندر یہ

نظام کہ وہ باہر سے آکسیجن کو لے اور اندر سے کاربن ڈائی آکسائڈ کو خارج کرے ـــــ اس قسم کی باتیں دہشت ناک حد تک عجیب ہیں۔ جب ایک آدمی ان کا واقعی احساس کرتا ہے تو اس کی زبان سے بے ساختہ طور پر حمد و شکر کا سیلاب جاری ہو جاتا ہے۔

اسی طرح انسان یہ محسوس کرتا ہے کہ اس کو پانی اور خوراک کی ضرورت ہے اور پھر وہ پاتا ہے کہ صاف و ستھرا پانی، طرح طرح کی صحت بخش غذائیں زمین پر وافر مقدار میں موجود ہیں۔ انسان کو اپنا جسم ڈھانکنے کے لئے کپڑے کی ضرورت ہے اور زمین پر ایسی چیزیں کثیر مقدار میں رکھی گئی ہیں جن میں تصرف کر کے وہ انھیں کپڑے کی صورت دے سکے۔ انسان کو اپنے تمدن کی تعمیر کے لئے بہت سی مادی چیزیں درکار ہیں۔ یہاں وہ پاتا ہے کہ زمین کے اندر مختلف قسم کی معدنیات کا ذخیرہ بہت بڑی مقدار میں پیشگی طور پر رکھ دیا گیا ہے جن کو استعمال کر کے وہ اپنے لئے شاندار تمدنی زندگی کی تعمیر کرے۔

اسی طرح انسان کو زندگی کی بقا اور ترقی کے لئے بے شمار چیزوں کی ضرورت ہے۔ یہ تمام چیزیں موجودہ دنیا میں اس حالت میں ذخیرہ کر دی گئی ہیں کہ انسان انھیں با آسانی دریافت کر لے اور انھیں بڑے پیمانہ پر استعمال کر سکے۔ ان میں وہ چیزیں بھی شامل ہیں جن کو انسان نے جان لیا ہے اور وہ چیزیں بھی جن کو انسان نے ابھی تک نہیں جانا ہے۔

یہی علم اور شعور وہ چیز ہے جس کا ادراک آدمی کے اندر وہ جذبات پیدا کرتا ہے جس کو قرآن میں حمد کہا گیا ہے۔ خدا کی نعمتوں کا یہ شعور آدمی کو خدا سے قریب کرتا ہے۔ وہ خدا کو یاد کرنے والا بن جاتا ہے۔ وہ غیب میں خدا کا اس طرح ادراک کرنے لگتا ہے جیسے کہ وہ اسے دیکھ رہا ہو۔

2-003

کتابِ لاریب

قرآن کی پہلی سورۃ الفاتحہ گویا کہ قرآن کا دیباچہ ہے۔ اس مختصر سورۃ کے فوراً بعد سورہ البقرہ ہے۔ اس سورہ کا پہلا جملہ یہ ہے: **ذالك الكتب لاريب فيه** (البقرہ ۲) یعنی یہ کتاب ایسی

ہے جس میں کوئی شک نہیں۔اس آیت میں الکتب سے مراد قرآن ہے۔ جیسا کہ معلوم ہے، قرآن قیامت تک کے لئے ہے۔ اس لئے اس قرآنی بیان کا تعلق ان تمام زمانوں سے ہے جو قیامت تک انسان کے اوپر گزریں گے۔

اس طرح یہ قرآنی بیان گویا کہ ایک ابدی چیلنج ہے۔اس میں قرآن کی بابت اس یقینی مستقبل کا اعلان کیا گیا ہے کہ کبھی بھی کوئی فرد یا گروہ اس میں شک نہ ڈال سکے گا، یہ کتاب انسانی تاریخ کے آخری مرحلے تک ہر قسم کے شک وشبہہ سے پاک رہے گی۔

یہ استثنائی حد تک ایک ایسا انوکھا کلام ہے جس کی نظیر کسی بھی دوسری مذہبی کتاب میں موجود نہیں ہے۔ مثال کے طور پر بائبل میں جن باتوں کو رسولوں کی طرف منسوب کیا گیا ہے ان کے بارے میں اہل علم نے اس شک کا اظہار کیا ہے کہ تاریخی طور پر ان باتوں کا انتساب مذکورہ رسولوں سے ثابت شدہ نہیں۔اسی طرح ہندوازم کی مذہبی کتاب بھاگوت گیتا کے بارے میں اہل علم نے یہ شبہہ ظاہر کیا ہے کہ وہ فی الواقع میدانِ جنگ کا کلام ہے جو کرشن نے ارجن سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا۔یا وہ بہت بعد کو رامائن میں شامل کر دیا گیا ہے۔اسی طرح گوتم بدھ سے جس کلام کو منسوب کیا جاتا ہے اس کے بارے میں اہل علم کو یہ شک ہے کہ وہ موجودہ ریکارڈ کے مطابق پالی یا سنسکرت میں تھا یا کسی اور زبان میں، وغیرہ۔

مگر جہاں تک قرآن کا معاملہ ہے، وہ اس قسم کے شک سے مکمل طور پر پاک ہے۔اس کے نزول کو چودہ سو سال ہو چکے ہیں اس کے باوجود آج تک کوئی صاحب علم اس میں اس شک کی گنجائش نہ پا سکا کہ یہ وہی عربی کلام ہے جس کو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے عرب میں خدائی کلام کے طور پر پیش کیا تھا۔ آج بھی پورا قرآن اپنی اصل ابتدائی حیثیت میں ہے اور عین اسی زبان میں موجود ہے جیسا کہ وہ چودہ سو سال پہلے تھا۔

اسی طرح شک کے دوسرے جتنے پہلو ہیں، ان سب کے اعتبار سے قرآن اپنی غیر مشتبہ حیثیت کو مسلسل باقی رکھے ہوئے ہے۔ قرآن میں بہت سے ایسے حوالے ہیں جو انسانی علوم سے

تعلق رکھتے ہیں۔ مثلاً حیاتیات، نباتات، ارضیات، فلکیات، معدنیات، معاشیات، اور تاریخ، وغیرہ۔ یہ علوم نزولِ قرآن کے وقت اپنی ابتدائی حالت میں تھے۔ بعد کو ان میں اضافہ ہوتا رہا یہاں تک کہ موجودہ زمانے میں یہ تمام علوم اتنا زیادہ ترقی کر گئے جو نزول قرآن کے زمانے میں ناقابلِ قیاس تھا۔

مگر یہ حیرت انگیز بات ہے کہ بعد کے زمانے کی علمی ترقیاں قرآن کے کسی بھی بیان کو مشکوک ثابت نہ کر سکیں۔ قرآن کا ہر بیان اپنی صداقت کو بدستور برقرار رکھے ہوئے ہے۔

مثال کے طور پر قرآن کی ایک آیت ہے: کیا انکار کرنے والوں نے نہیں دیکھا کہ آسمان اور زمین دونوں ملے ہوئے تھے پھر ہم نے ان کو کھول دیا۔ (الانبیاء ۳۰) قرآن کی اس آیت میں جس کائناتی حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے وہ نزول قرآن کے وقت سراسر غیر معلوم تھی، حتی کہ بعد کی صدیوں میں جب کہ قرآن کی تفسیریں لکھی گئیں تو ان تفسیروں میں بھی اس کی کوئی واضح تشریح نہ کی جا سکی۔ موجودہ زمانے میں علمی ترقی کے بعد اگر بالفرض یہ معلوم ہوتا کہ زمین و آسمان (یا ستارے اور سیارے) اب جس طرح لامحدود خلا میں پھیلے ہوئے ہیں اسی طرح وہ اپنی ابتدا سے ہیں تو کسی کو قرآن کے مذکورہ بیان پر شک کے اظہار کا موقع مل سکتا تھا۔ لیکن بعد کی علمی ترقیوں نے حیرت انگیز طور پر یہ ثابت کیا کہ زمین و آسمان ابتداء میں ایک سپر ایٹم کی صورت میں جڑے ہوئے تھے اس کے بعد اس کے اندر ایک دھماکہ ہوا جس کے نتیجہ میں موجودہ پھیلتی ہوئی کائنات وجود میں آئی۔

یہی معاملہ علم انسانی کے تمام دوسرے شعبوں کا ہے۔ مثال کے طور پر قرآن کے ایک تاریخی بیان کو لیجئے۔ قرآن میں حضرت موسیٰ کے ہم عصر فرعون کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ جب وہ غرق ہونے لگا تو خدا نے اس سے کہا: اليوم ننجيك ببدنك لتكون لمن خلفك آية (یونس ۹۲) یعنی آج ہم تیرے بدن کو بچائیں گے تاکہ تو اپنے بعد والوں کے لئے نشانی بنے۔

اس میں بتایا گیا ہے کہ غرق شدہ فرعون کا جسم بدستور محفوظ ہے تاکہ وہ بعد والوں کے

لئے نشانی بنے۔ مگر نزول قرآن کے وقت یہ واقعہ سراسر غیر معلوم تھا۔ حتی کہ بعد کی صدیوں میں جب کہ قرآن کی تفسیریں کی گئیں، ان میں بھی مفسرین اس کی کوئی واضح تفسیر نہ کر سکے۔ اب اگر ماضی کی طرح بعد کے زمانہ میں بھی فرعونِ موسیٰ کا جسم غیر معلوم رہتا تو کسی کو یہ موقع مل سکتا تھا کہ وہ قرآن کے اس بیان پر شک ظاہر کرے۔ لیکن یہ حیرت انگیز بات ہے کہ موجودہ زمانہ میں علم کی ترقی نے اس شک سے پردہ اٹھایا اور اس نے قرآن کے اس بیان کی صداقت ثابت کر دی۔

انیسویں صدی کے آخر میں ایک یورپین اسکالر نے مصر کی ایک قدیم عمارت سے مومیائی کی ہوئی ایک لاش نکالی۔ یہ لاش اب قاہرہ کے میوزیم میں شیشہ کے کیس میں رکھی ہوئی ہے۔ بیسویں صدی کے نصف اول میں اس لاش پر مختلف قسم کی تحقیق کی گئی۔ اسی کے ساتھ جدید سائنسی طریقہ کے مطابق اس کی عمر معلوم کی گئی۔ یہاں تک کہ یہ ثابت ہو گیا کہ یہ لاش اسی فرعون کی ہے جو موسیٰ کے زمانہ میں اپنے لشکر کے ساتھ غرق ہوا تھا۔

اسی طرح جس پہلو سے بھی قرآن کا جائزہ لیا جائے وہ ایک ایسی کتاب ثابت ہوتا ہے جس میں کسی قسم کے شک وشبہہ کی گنجائش نہیں ہے۔ قرآن کی پوری تاریخ غیر مشتبہ طور پر معلوم ہے۔ قرآن کا ہر اعلان اپنی کامل صداقت کو مسلسل برقرار رکھے ہوئے۔ تقریباً ڈیڑھ ہزار سال کی مدت گزرنے کے باوجود اب تک کسی کو یہ موقع نہیں ملا کہ وہ قرآن پر کسی اعتبار سے کوئی شک ظاہر کر سکے۔

2-004

انسان کی تخلیق

قرآن میں انسان کی تخلیق کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد ہوا ہے کہ ـــــ اور جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔ فرشتوں نے کہا: کیا تو زمین میں ایسے لوگوں کو بسائے گا جو اس میں فساد کریں اور خون بہائیں۔ اور ہم تیری حمد کرتے ہیں اور تیری پاکی بیان کرتے ہیں۔ اللہ نے کہا میں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے، اور اللہ نے سکھا دئے آدم کو سارے نام، پھر ان کو فرشتوں کے سامنے پیش کیا اور کہا کہ اگر تم سچے ہو تو مجھے ان

لوگوں کے نام بتاؤ۔ فرشتوں نے کہا کہ توپاک ہے۔ ہم تو وہی جانتے ہیں جو تو نے ہمیں بتایا۔ بے شک تو ہی علم والا اور حکمت والا ہے۔ اللہ نے کہا اے آدم ان کو بتاؤ ان لوگوں کے نام۔ تو جب آدم نے بتائے ان کو ان لوگوں کے نام تو اللہ نے کہا کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ آسمانوں اور زمین کے بھید کو میں ہی جانتا ہوں۔ اور مجھ کو معلوم ہے جو تم ظاہر کرتے ہو اور جو تم چھپاتے ہو۔ (البقرہ ۳۰۔۳۳)

اللہ نے انسان کو ایک آزاد مخلوق کی حیثیت سے پیدا کیا ہے۔ اس بنا پر فرشتوں کو یہ اندیشہ تھا کہ انسان اپنی آزادی کا غلط استعمال کرے گا اور زمین کو فساد اور خونریزی سے بھر دے گا۔ تاریخ کا تجربہ ثابت کرتا ہے کہ انسان کے بارے میں فرشتوں کا یہ اندیشہ بالکل درست تھا۔ ایسی حالت میں یہ سوال ہے کہ اللہ نے انسان کو کیوں پیدا کیا۔ اللہ کو اپنے بندوں سے جو چیز مطلوب ہے وہ فرشتوں کے الفاظ میں، اس کی تحمید و تقدیس ہے، اور ان گنت فرشتے ہر لمحہ یہ مطلوب کام ساری کائنات میں انجام دے رہے ہیں۔ ایسی حالت میں انسان جیسی سرکش مخلوق کو پیدا کرنے کی کیا ضرورت تھی۔

اصل یہ ہے کہ فرشتے جو تحمید و تقدیس کر رہے ہیں وہ مجبورانہ تحمید و تقدیس ہے، کیوں کہ وہ اس کے سوا کچھ اور کر ہی نہیں سکتے۔ اب اللہ نے یہ چاہا کہ وہ ایسی مخلوق پیدا کرے جو خود اپنے آزادانہ فیصلے کے تحت اپنے آپ کو اللہ کی اطاعت میں دے اور ذاتی اختیار کے تحت اللہ کی حمد و تقدیس کرے۔ فرشتوں کے شبہہ کو اللہ نے اس طرح رفع کیا کہ پوری نسل انسانی کو اپنی قدرت سے بیک وقت پیدا کیا (الاعراف ۱۷۲) اور اپنی خصوصی قدرت سے آدم کو ان سب سے متعارف کرایا اور پھر آدم سے کہا کہ ان کا تعارف کر کے فرشتوں کو بتاؤ کہ ان میں کیسے کیسے لوگ پیدا ہوں گے۔ اس تعارف کے بعد فرشتوں نے مانا کہ انسانوں میں اگر ابو جہل اور ابو لہب جیسے لوگ ہوں گے تو اسی کے ساتھ ان میں ابو بکر اور عمر جیسے لوگ بھی پیدا ہوں گے۔ اس تعارف کے بعد فرشتے مطمئن ہو گئے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ نہ صرف فرشتے بلکہ پوری وسیع کائنات اور اس میں پھیلی ہوئی بے

شمار مخلوقات سب کی سب ہر آن خدا کی حمد و تقدیس میں مشغول ہیں، جیسا کہ دوسری آیتوں سے معلوم ہوتا ہے۔ مگر یہ بے شمار چیزیں جو کچھ کر رہی ہیں وہ اپنے آزاد فیصلے کے تحت نہیں کر رہی ہیں۔ وہ اس لئے ایسا کر رہی ہیں کہ تقدیر الٰہی کے تحت ان کے لئے کچھ اور کرنا ممکن ہی نہیں۔ یہ صرف انسان ہے جس کو انتہائی استثنائی طور پر موت تک کے لئے اختیار کی آزادی دی گئی ہے۔ دوسری چیزوں کی حمد و تقدیس گویا ایک ٹیپ ریکارڈ کی آواز کے مانند ہے اور انسان کی حمد و تقدیس ایک زندہ اور آزاد ہستی کی زبان سے نکلنے والی با اختیار آواز کی مانند۔ اور دونوں میں اتنا زیادہ فرق ہے کہ مجبورانہ حمد و تقدیس اگر پوری کائنات کے برابر ہو تب بھی ایک انسان کی آزاد حمد و تقدیس اس کے اوپر بھاری ہو جائے گی۔

اصل یہ ہے کہ اللہ نے ایک انتہائی نفیس قسم کی معیاری دنیا بنائی جس کا نام جنت ہے۔ ابدی لذت و راحت والی اس دنیا کے لئے اللہ کو کچھ باشندے درکار ہیں جن کو وہاں بسایا جائے۔ انہی خوش نصیب روحوں کے انتخاب کے لئے موجودہ دنیا بنائی گئی۔ ایک محدود مدت تک انسانوں کو ان کا امتحان لینے کے لئے یہاں بھیجا جاتا رہے گا اور جب خدا کا اندازہ مکمل ہو جائے گا اور مطلوب انسانوں کا انتخاب کیا جا چکا ہو گا تو اس کے بعد یہ دنیا ختم کر دی جائے گی۔ اب منتخب افراد کو جنت کی کالونیوں میں ہمیشہ کے لئے بسایا جائے گا۔ اور بقیہ لوگوں کو الگ کر کے انھیں جہنم کے کوڑا خانے میں ڈال دیا جائے گا تاکہ وہ ابدی حسرت کی سزا بھگتتے رہیں۔

یہ مطلوب انسان وہ ہیں جنھوں نے گمراہیوں کے جنگل میں خدا کو دریافت کیا۔ جنھوں نے بدی کے اندھیروں میں نیکی کا راستہ تلاش کرنے میں کامیابی حاصل کی۔ جنھوں نے سرکشی کے ماحول میں خود اپنے آزاد فیصلے کے تحت اپنے آپ کو خدا کی پابندی میں دے دیا۔ جنھوں نے انانیت کے طوفان میں تواضع کی روش اختیار کی۔ جن کے اقتدار نے ان کو نہیں بگاڑا۔ جن کو مال ملا مگر وہ فخر کی نفسیات میں مبتلا نہیں ہوئے۔ جن کو موقع تھا کہ وہ اپنی ذات کے لئے جئیں، اس کے باوجود وہ ایک خدا کے لئے جئے۔ جو ڈرے تو صرف خدا سے ڈرے اور جنھوں نے محبت کی تو

صرف خدا سے محبت کی۔ جن کی خود پسندی ان کے لئے حق کے اعتراف میں رکاوٹ نہیں بنی۔ جو چلنے کی طاقت رکھتے ہوئے خدا کے خوف سے نہیں چلے۔ جن کے پاس بولنے کے لئے زبان تھی مگر خدا کی پکڑ کے احساس نے انھیں بولنے سے روک دیا۔

یہ مطلوب انسان وہ ہے جس نے غیب کا پردہ ہٹنے سے پہلے خدا کو دیکھا اور وہ اس کے آگے ڈھہ پڑا۔ جس نے آخرت کی پکڑ کو اتنی زیادہ شدت کے ساتھ محسوس کیا کہ آخرت میں احتساب کئے جانے سے پہلے دنیا ہی میں خود اپنا احتساب کر لیا۔ جس کا حال یہ ہوا کہ خدا کے ساتھ شدید محبت نے اس کے دل سے دوسری تمام محبتیں نکال دیں۔ اور خدا کے ساتھ شدید خوف نے اس کے لئے دنیا کی تمام خوشیوں اور راحتوں کو بے قیمت بنا دیا۔

2-005

گروہی نجات نہیں

آخرت کی کامیابی کا تعلق کسی بھی درجہ میں گروہ بندی سے نہیں ہے۔ اس کا انحصار تمام تر عمل پر ہے نہ کہ گروہی تعلق پر۔ قرآن کی ایک آیت اس معاملے کو واضح کرتی ہے۔ اس کا ترجمہ یہ ہے: بے شک جو لوگ مسلمان ہوئے اور جو لوگ یہودی ہوئے اور نصاریٰ اور صابی' ان میں سے جو شخص ایمان لایا اللہ پر اور آخرت کے دن پر اور اس نے نیک کام کیا تو اس کے لئے اس کے رب کے پاس اجر ہے۔ اور ان کے لئے نہ کوئی ڈر ہے اور نہ وہ غم گین ہوں گے۔ (البقرہ ۶۲)

قرآن کی یہ آیت گروہی نجات کے نظریہ کی نفی کرتی ہے۔ اس آیت میں مسلم گروہ کو بھی دوسرے مذہبی گروہوں کے ساتھ یکساں طور پر بریکٹ کیا گیا ہے۔ اس آیت کے مطابق' گروہ کے اعتبار سے خدا کے نزدیک ایک اور دوسرے میں کوئی فرق نہیں ہے۔ فرق جو کچھ ہے وہ افراد کی ذاتی سیرت کے اعتبار سے ہے نہ کہ کسی گروہ سے وابستگی کے اعتبار سے۔

آیت میں چار گروہ کا ذکر ہے۔ ایک مسلمان جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امت ہیں۔ دوسرے' یہود جو اپنے کو حضرت موسیٰ کی امت کہتے ہیں۔ تیسرے نصاریٰ جو حضرت مسیح

کی امت ہونے کے دعویدار ہیں۔ چوتھے' صابی جو اپنے کو حضرت یحیٰ کی امت بتاتے تھے۔ اور قدیم زمانے میں عراق کے علاقے میں آباد تھے۔ وہ اہل کتاب تھے اور کعبہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے تھے۔ مگر اب صابی فرقہ ختم ہو چکا ہے۔ دنیا میں اب کہیں اس کا وجود نہیں۔

یہاں مسلمانوں کو دوسرے گروہوں سے الگ نہیں کیا گیا ہے۔ بلکہ ان کا اور دوسرے پیغمبروں سے نسبت رکھنے والی امتوں کا' ذکر ایک ساتھ کیا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ گروہ ہونے کے اعتبار سے اللہ کے نزدیک سب برابر کا درجہ رکھتے ہیں۔ گروہ کے اعتبار سے ایک گروہ اور دوسرے گروہ میں کوئی فرق نہیں۔ سب کی نجات کا ایک ہی محکم اصول ہے۔ اور وہ ہے ایمان اور عمل صالح۔ کوئی گروہ خواہ اپنے کو مسلمان کہتا ہو یا وہ اپنے کو یہودی یا مسیحی یا صابی یا کچھ اور کہے' ان میں سے کوئی بھی گروہ محض ایک مخصوص گروہ ہونے کی بنا پر خدا کے یہاں کوئی خصوصی درجہ نہیں رکھتا۔ درجہ کا اعتبار اس پر ہے کہ کس نے خدا کی منشا کے مطابق' اپنی عملی زندگی کو ڈھالا۔

پیغمبر کے زمانے میں جب اس کے ماننے والوں کا گروہ بنتا ہے تو اس کی بنیاد ہمیشہ ایمان اور عمل صالح پر ہوتی ہے۔ اس وقت ایسا ہوتا ہے کہ نبی کی پکار کو سن کر کچھ لوگوں کے اندر ذہنی اور فکری انقلاب آتا ہے۔ ان کے اندر ایک نیا عزم جاگتا ہے۔ ان کی زندگی کا نقشہ جو اب تک ذاتی خواہشوں کی بنیاد پر چل رہا تھا وہ خدائی تعلیمات کی بنیاد پر قائم ہو جاتا ہے۔ یہی لوگ حقیقی معنوں میں پیغمبر کی امت ہوتے ہیں۔ ان کے لئے پیغمبر کی زبان سے آخرت کی نعمتوں کی بشارت دی جاتی ہے۔

مگر بعد کی نسلوں میں صورت حال بدل جاتی ہے۔ اب خدا کا دین ان کے لئے ایک قسم کی قومی روایت بن جاتا ہے۔ جو بشارتیں ایمان و عمل کی بنیاد پر دی گئی تھیں ان کو محض گروہی تعلق کا نتیجہ سمجھ لیا جاتا ہے۔ وہ گمان کر لیتے ہیں کہ ان کے گروہ کا اللہ سے کوئی خاص رشتہ ہے' جو دوسرے لوگوں سے نہیں ہے۔ جو شخص اس مخصوص گروہ سے تعلق رکھے' خواہ عقیدہ اور عمل کے اعتبار سے وہ کیسا ہی ہو بہر حال اس کی نجات ہو کر رہے گی۔ جنت اس کے اپنے گروہ کے لئے

ہے۔اور جہنم صرف دوسرے گروہوں کے لئے۔

مگر اللہ کا کسی گروہ سے خصوصی رشتہ نہیں۔ اللہ کے یہاں جو کچھ اعتبار ہے وہ صرف اس بات کا ہے کہ آدمی اپنے فکر اور عمل میں کیسا ہے۔ آخرت میں آدمی کے انجام کا فیصلہ اس کے حقیقی کردار کی بنیاد پر ہوگا نہ کہ گروہی نسبتوں کی بنیاد پر۔

جب کوئی دینی تحریک اٹھتی ہے تو دھیرے دھیرے اس کا ایک گروہ بن جاتا ہے۔ لیکن گروہ کی اہمیت جو کچھ ہے وہ صرف دنیا کے اعتبار سے ہے۔ آخرت میں ہر آدمی خدا کے یہاں اکیلا پہنچے گا۔ ہر فرد اپنے ذاتی کردار کی بنیاد پر یا سزا کا مستحق قرار پائے گا یا انعام کا۔

2-006

امت وسط

امت محمدی کی حیثیت بتاتے ہوئے قرآن میں ارشاد ہوا ہے: اور اسی طرح ہم نے تم کو بیچ کی امت بنادیا تا کہ تم ہو بتانے والے لوگوں پر اور رسول ہو تم پر بتانے والا۔ اور جس قبلہ پر تم تھے، ہم نے اس کو صرف اس لئے ٹھہرایا تھا کہ ہم جان لیں کہ کون رسول کی پیروی کرتا ہے اور کون اس سے الٹے پاؤں پھر جاتا ہے۔ اور بے شک یہ بات بھاری ہے مگر ان لوگوں پر جن کو اللہ نے ہدایت دی ہے۔ اور اللہ ایسا نہیں کہ تمہارے ایمان کو ضائع کردے۔ بے شک اللہ لوگوں کے ساتھ شفقت کرنے والا مہربان ہے (البقرہ ۱۴۳)

وسط کے معنی بیچ کے ہیں۔ امت وسط کا مطلب ہے بیچ کی امت۔ امت محمدی کو امت وسط اس لئے کہا گیا ہے کہ وہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور اقوام عالم کے درمیان بیچ کی کڑی ہے۔ انھیں پیغمبر اسلام سے خدا کے دین کو کسی کمی بیشی کے بغیر لینا ہے اور پھر اس کو ٹھیک ویسا ہی اقوام عالم تک پہنچانا ہے۔ یہ عمل نسل در نسل مسلسل جاری رکھنا ہے، یہاں تک کہ قیامت آجائے۔

مفسر ابن زید نے آیت کی تشریح کرتے ہوئے کہا ہے کہ (وکذالك جعلناکم أمة وسطا) قال: هم وسط بين النبی صلی الله علیه وسلم وبین الامم۔ (تفسیر الطبری ۸/۲)

یعنی آیت کا مطلب یہ ہے کہ اہل اسلام رسول اللہ ﷺ اور دیگر اقوام کے درمیان ہیں۔

خدا کے تخلیقی نقشہ کے مطابق، عالم انسانی کی یہ ایک مستقل ضرورت ہے کہ اس کے درمیان ہرنسل میں اور ہر گروہ میں ایسے افراد پیدا ہوتے رہیں جو انسانوں کو مسلسل خدا کے تخلیقی نقشہ سے باخبر کرتے رہیں تاکہ انسان دنیا میں غفلت کی حالت میں نہ جئے بلکہ حقیقت سے پوری طرح باخبر ہو کر زندگی گزارے۔ اسی مشن کے تحت پچھلے زمانوں میں بار بار خدا کے پیغمبر آتے رہے۔ پیغمبر اسلام اس سلسلۂ نبوت کی آخری کڑی تھے۔ اب آپ کے بعد کوئی پیغمبر آنے والا نہیں۔

اب اگر چہ سلسلۂ نبوت بند ہو چکا ہے، لیکن کارِ نبوت اب بھی پوری طرح باقی ہے۔ تاکہ انسانیت کی اگلی نسلوں تک بھی اسی طرح حق کا پیغام پہنچتا رہے جس طرح وہ پچھلی نسلوں تک پہنچتا رہا۔ بعد کے زمانے میں پیغام رسانی کے اسی کام کو جاری رکھنے کے لئے امت محمدی کو امت وسط بنایا گیا۔ یہ امت محمدی کی لازمی ذمہ داری ہے۔ اگر وہ مسلسل پیغام رسانی کے اس کام کو انجام نہ دے تو اس کا امت محمدی ہونا ہی اللہ کی نظر میں مشتبہ ہو جائے گا۔

2-007

روزہ اسلام میں

قرآن میں اہل ایمان کو خطاب کرتے ہوئے ارشاد ہوا ہے کہ اے ایمان والو، تم پر روزہ فرض کیا گیا جس طرح وہ تم سے اگلوں پر فرض کیا گیا تھا تاکہ تم متقی بنو (البقرہ ۱۸۳) اس کے بعد یہ حکم دیا گیا ہے کہ اہل ایمان ہر سال رمضان کے مہینے میں پورے مہینہ کا روزہ رکھیں۔ اس کی حکمت یہ بتائی گئی کہ اس سے ان کے اندر شکر کا جذبہ پیدا ہو گا۔ اس کے فوراً بعد فرمایا کہ ـــــ اور جب میرے بندے تم سے میری بابت پوچھیں تو میں نزدیک ہوں پکارنے والے کی پکار کا جواب دیتا ہوں۔ تو چاہئے کہ وہ میرا حکم مانیں اور مجھ پر یقین رکھیں تاکہ وہ ہدایت پائیں۔ (البقرہ ۱۸۶)

روزہ کا تفصیلی حکم قرآن میں اسی ایک مقام پر آیا ہے۔ ان آیات کے مطالعے سے روزہ کے بارے میں جو بنیادی احکام معلوم ہوتے ہیں وہ یہ ہیں:

۱۔ پہلی بات یہ بتائی گئی کہ روزہ ایک ایسی عبادت ہے جس کا حکم پچھلے پیغمبروں کی شریعت میں بھی دیا جاتا رہا ہے۔ جیسا کہ معلوم ہے، پچھلے پیغمبر ہر زمانے میں اور ہر مقام پر آتے رہے ہیں۔ اس سے یہ بات ثابت ہوئی کہ روزہ کا تعلق زمانی حالات یا جغرافی اسباب سے نہیں ہے۔ وہ نماز کی طرح ایک مطلق عبادت ہے۔ روزہ ہمیشہ اور ہر حال میں فرض رہا ہے۔ اور ہمیشہ رہے گا۔ شرعی عذر کے سوا کوئی اور چیز اس کو ساقط کرنے والی نہیں۔

۲۔ روزہ کا ایک مقصد قرآن میں تقویٰ بتایا گیا ہے۔ یعنی روزہ آدمی کے اندر اللہ کا ڈر پیدا کرتا ہے۔ اللہ سے ڈرنا کیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ آدمی ہر چیز کے بارے میں یہ یقین کرے کہ وہ خدا کا عطیہ ہے۔ اور خدا جب چاہے ان چیزوں کو چھین لے اور ہمیں محروم کر کے رکھ دے۔ رمضان کا روزہ آدمی کے اندر یہی احساس پیدا کرنے کی ایک سالانہ تدبیر ہے۔ اس مہینے میں آدمی خود اپنے ارادہ سے اپنے آپ کو کھانے اور پینے سے وقتی طور پر محروم کرتا ہے۔ اس طرح اپنے آپ پر بھوک اور پیاس طاری کر کے یہ تجربہ کرتا ہے کہ اگر خدا اس کو مستقل طور پر کھانے اور پینے سے محروم کر دے تو وہ کتنی بڑی مصیبت میں مبتلا ہو جائے گا۔ یہ احساس اس کے اندر وہ ربانی کیفیت پیدا کرتا ہے جس کو قرآن میں تقویٰ کہا گیا ہے۔

۳۔ روزہ کا دوسرا فائدہ قرآن میں یہ بتایا گیا ہے کہ وہ آدمی کے اندر شکر کا جذبہ پیدا کرتا ہے۔ آدمی اپنا سارا دن بھوک اور پیاس میں گزارتا ہے۔ یہاں تک کہ اس حال میں شام آجاتی ہے اور سورج غروب ہوتا ہے۔ اب وہ اپنا روزہ توڑتا ہے اور سیر ہو کر کھاتا اور پیتا ہے۔ اس کے بعد آدمی کا حال وہ ہو جاتا ہے جس کو ایک مسنون دعا میں اس طرح بتایا گیا ہے: **ذهب الظماء وابتلت العروق** (پیاس چلی گئی اور رگیں تر ہو گئیں)

روزہ کے بعد افطار کا طریقہ آدمی کو تجرباتی طور پر اس حقیقت کی یاد دلاتا ہے کہ خدا نے پانی اور غذا کی صورت میں انسان کے لئے کتنی بڑی نعمت پیدا کی ہے۔ اور پھر ایک نعمت کے بارے میں یہ تجربہ آدمی کو دوسری تمام نعمتوں کی یاد دلاتا ہے۔ اور اس کا سینہ شکر خداوندی کے

جذبہ سے بھر جاتا ہے۔ اس طرح روزہ آدمی کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ شکر کرنے والا بن کر خدا کی دنیا میں رہے۔

۴۔ روزہ کی عبادت آدمی کے اندر ایک اور اہم صفت پیدا کرتی ہے۔ اور وہ دعا ہے۔ روزہ کا مہینہ روزہ دار کے لئے روحانی تربیت کا مہینہ ہے۔ اس مہینہ میں آدمی بھوک پیاس کی مشقت اٹھا کر اپنے وجود کے مادی پہلو کو دباتا ہے اور اس کے غیر مادی پہلو کو ابھارتا ہے۔ نمازوں کی کثرت اس کے اندر عبدیت کے احساس کو بیدار کرتی ہے۔ قرآن کو زیادہ سے زیادہ سننے اور پڑھنے سے اس پر قرآن کے معانی کھلتے ہیں۔ اور اس کے اندر خدا کی عظمت کا شعور جاگتا ہے۔ وہ خدا سے ڈرنے والا، خدا کا شکر کرنے والا اور اس کی بڑائی کرنے والا بن جاتا ہے۔

اس طرح روزہ آدمی کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ خدا سے سچی دعا کرنے والا بن جائے۔ اس کی دعا کیفیات سے بھری ہوئی دعا ہو۔ اس کی دعا ایک تڑپنے والے انسان کی دعا ہو۔ اس کی دعا ایک ایسے انسان کی دعا ہو جو خدا کے پاس پہنچ جائے، جو خدا کے عین قریب ہو کر اس کو پکارنے لگے۔

2-008

قانون فطرت

قوموں کے عروج وزوال کے باب میں فطرت کا ایک قانون بتاتے ہوئے قرآن میں ارشاد ہوا ہے: کتنی ہی چھوٹی جماعتیں اللہ کے حکم سے بڑی جماعتوں پر غالب آئی ہیں اور اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ (البقرہ ۲۴۹)

اس آیت میں اذن اللہ سے مراد فطرت کا قانون ہے اور فطرت کا یہ قانون صبر کے اصول پر مبنی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ دنیا میں کوئی چھوٹا گروہ محض چھوٹا ہونے کی بنا پر مغلوب نہیں ہو جاتا۔ اگر وہ صبر کا ثبوت دے تو عین ممکن ہے کہ وہ اپنے سے بڑے گروہ پر غالب آجائے۔

یہ معاملہ کوئی پراسرار معاملہ نہیں۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جو نفسیات انسانی کے جائزہ اور قوموں کی تاریخ کے مطالعہ سے سمجھی جاسکتی ہے۔ اصل یہ ہے کہ ہر انسان پیدائشی طور پر اتھاہ

صلاحیت کا مالک ہوتا ہے مگر یہ صلاحیت عام حالات میں آدمی کے اندر چھپی ہوئی ہوتی ہے۔ اس چھپی ہوئی صلاحیت کو جو چیز جگاتی ہے وہ چیلنج ہے۔ جس فرد یا قوم کو اپنے ماحول کی طرف سے چیلنج پیش آئے، اس کی صلاحیت جاگ اٹھے گی۔ وہ پہلے اگر صرف ایک بشر (man) تھا تو چیلنج کی زد میں آنے کے بعد وہ فوق البشر (super man) بن جائے گا۔ اب وہ ایسے کارنامے انجام دے گا جس کا تصور بھی چیلنج سے پہلے نہیں کیا جا سکتا تھا۔

جس سماج میں دو گروہ ہوں، ایک اقلیتی گروہ اور دوسرا اکثریتی گروہ، ایسے سماج میں ہمیشہ ایسا ہوتا ہے کہ اکثریت کی طرف سے اقلیت کو چیلنج پیش آتا ہے۔ زندگی کے ہر محاذ پر اقلیت کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ اکثریت اس کو دبا لے گی۔ وہ اکثریت کے مقابلہ میں مغلوب ہو کر رہ جائے گا۔

یہ صورت حال اقلیت کے لئے ایک سخت امتحان ہوتی ہے۔ اب اس کے لئے رد عمل کی دو صورتیں ہوتی ہیں۔ ایک صابرانہ رد عمل، دوسرا غیر صابرانہ رد عمل۔ غیر صابرانہ رد عمل یہ ہے کہ اقلیتی گروہ شکایت اور احتجاج کی نفسیات میں مبتلا ہو جائے۔ وہ منفی طریقوں سے اس کا جواب دینے کی کوشش کرے۔ یہ گویا چیلنج کے مقابلہ میں منفی جواب (negative response) دینا ہے۔ اور جو اقلیت چیلنج کے مقابلہ میں اس قسم کا منفی جواب دے وہ مایوسی اور پست ہمتی کا شکار ہو کر رہ جائے گی۔ اس کی فطری صلاحتیں بدستور خوابیدہ حالت میں پڑی رہیں گی۔ ایسی اقلیت چیلنج کے اندر گھر کر اسی طرح ختم ہو جائے گی جس طرح چھوٹی چڑیاں طوفان میں گھر کر ختم ہو جاتی ہیں۔

اس کے برعکس جو اقلیت چیلنج کے مقابلہ میں صابرانہ روش کا ثبوت دے وہ گویا طوفان کی بڑی چڑیا (big bird of the storm) ہے۔ وہ اپنے طاقتور بازوؤں سے اڑ کر اوپر چلی جائے گی اور اس طرح اپنے آپ کو طوفان کی زد سے بچا لے گی۔

چیلنج کے مقابلہ میں صبر کا رویہ اختیار کرنے کا مطلب یہ ہے کہ آدمی مقابلہ کی نفسیات کے ساتھ اس کا استقبال کرے۔ وہ اپنے آپ کو اس سے بچائے کہ اس کا دماغ درہم برہم ہو جائے

اور وہ پیش آمدہ صورت حال کے مقابلہ میں مثبت طور پر سوچنے کے قابل نہ رہے۔ جو فرد یا گروہ چیلنج کے مقابلہ میں اس طرح مثبت جواب (positive response) کا انداز اختیار کرے اس کا فائدہ اس کو یہ ملتا ہے کہ اس کے اندر نیا حوصلہ ابھر آتا ہے۔ اس کی سوئی ہوئی صلاحیتیں جاگ اٹھتی ہیں۔ اس کے اندر وہ فکری انقلاب پیدا ہوتا ہے جس کو نفسیات کی زبان میں دماغی طوفان (brain storm) کہا جاتا ہے۔

یہ چیزیں اقلیتی افراد کے اندر سوئے ہوئے انسان کو بیدار کر دیتی ہیں۔ ایسے افراد زندگی کے ہر میدان میں اکثریت سے زیادہ عمل کا ثبوت دیتے ہیں۔ وہ اپنے ذہنی ارتقاء کی بنا پر اس قابل ہوتے ہیں کہ مسائل کا برتر حل (superior solution) تلاش کر سکیں۔ اقلیتی گروہ میں یہ تمام صفات صبر کے نتیجہ میں پیدا ہوتی ہیں اور فطرت کا یہ قانون ہے کہ زندگی کے معرکہ میں جو صبر کا ثبوت دیں اس دنیا میں وہ لازماً غلبہ حاصل کریں گے۔ حتی کہ اکثریتی گروہ کے مقابلہ میں بھی۔

2-009

ایک دعاء

سورہ البقرہ کا خاتمہ ایک دعا پر ہوتا ہے۔ وہ دعا یہ ہے: **ربنا لا تؤاخذنا ان نسينا أو اخطأنا ربنا ولا تحمل علينا اصراً كما حملته على الذين من قبلنا ربنا ولا تحملنا ما لا طاقة لنا به واعف عنا واغفرلنا و ارحمناأنت مولانا فانصرنا على القوم الكافرين (البقرہ ٢٨٦)**

اے ہمارے رب ہم کو نہ پکڑ اگر ہم بھولیں یا ہم غلطی کریں۔ اے ہمارے رب ہم پر وہ بوجھ نہ ڈال جو تو نے ڈالا تھا ہم سے اگلوں پر۔ اے ہمارے رب ہم پر وہ بوجھ نہ رکھ جس کی طاقت ہم کو نہیں اور در گزر کر ہم سے اور ہم کو بخش دے اور ہم پر رحم کر۔ تو ہمارا کار ساز ہے۔ پس انکار کرنے والوں کے مقابلہ میں ہماری مدد کر۔

دعا کیا ہے۔ دعا بندے کے قلبی احساسات کا خدا کے سامنے اظہار ہے۔ جب ایک انسان ایک طرف اپنے کامل عجز کو اور دوسری طرف خدا کی کامل قدرت کو دریافت کرتا ہے تو اس کے بعد فطری طور پر ایسا ہوتا ہے کہ وہ بے تابانہ طور پر خدا کو پکارنے لگتا ہے۔ اس کے اندر یہ تڑپ جاگ اٹھتی ہے کہ وہ اپنے سارے احساسات اور اپنے سارے جذبات کو اپنے رب کے سامنے پیش کر دے۔ وہ اپنی عبدیت اور خدا کی معبودیت کا کامل اظہار بن جائے۔ یہ لطیف احساسات جب لفظوں کی صورت میں ڈھل جائیں تو اسی کا نام دعا ہے۔

مذکورہ الفاظ بظاہر قرآن کے الفاظ ہیں مگر اپنی حقیقت کے اعتبار سے وہ فطرت انسان کی پکار ہے۔ ان الفاظ میں گویا کہ خود انسان کے خالق نے ایک سچے انسان کے اندر اٹھنے والے ربانی جذبات کو لفظوں میں ڈھال دیا ہے۔

ایک آدمی کو جب سچا ایمان حاصل ہوتا ہے تو وہ بے تابانہ طور پر یہ چاہنے لگتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو ہمہ تن خدا کی اطاعت میں دے دے۔ مگر ایک طرف خدا کی بے پناہ عظمت اور دوسری طرف اپنے بے پناہ عجز کی بنا پر اس کو محسوس ہوتا ہے کہ وہ اطاعت الٰہی کا حق ادا نہیں کر سکتا۔ اس کے یہ احساسات مذکورہ قسم کے دعائیہ الفاظ میں ڈھل جاتے ہیں۔ وہ یہ نہیں کہہ پاتا کہ خدایا! میں تیرے دربار میں اعمال کا تحفہ لے کر آیا ہوں تو اس کو قبول فرما۔ اس کی نظر اپنے کیے پر نہیں ہوتی بلکہ اس پر ہوتی ہے جو وہ نہ کر سکا ہو۔

ان احساسات کے تحت وہ پکار اٹھتا ہے کہ خدایا! میری غلطیوں اور خطاؤں کا مجھ سے حساب نہ لے۔ مجھ کو ان آزمائشوں میں نہ ڈال جن سے میرے پیش رؤوں کو گزرنا پڑا۔ خدایا! مجھ سے تھوڑے عمل کو قبول کر لے، کیوں کہ میرے اندر زیادہ عمل کی طاقت نہیں۔ خدایا جب تو میرا حساب لے تو میرے ساتھ معافی اور درگذر کا معاملہ فرما۔ اور مجھ کو اپنی رحمتوں کے سایہ میں لے لے۔ خدایا تو میرے دشمنوں کے خلاف میری مدد فرما، اور میری طرف سے ان کے مقابلہ کے لئے کافی ہو جا۔

3-010

محکم، متشابہ

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ اس کی آیتیں بنیادی طور پر دو قسم کی ہیں ــــ محکم اور متشابہ۔ اس سلسلے میں قرآن کا بیان یہ ہے: وہی ہے جس نے تمہارے اوپر کتاب اتاری۔ اس میں بعض آیتیں محکم ہیں، وہ کتاب کی اصل ہیں۔ اور دوسری آیتیں متشابہ ہیں۔ پس جن کے دلوں میں ٹیڑھ ہے وہ متشابہ آیتوں کے پیچھے پڑ جاتے ہیں فتنہ کی تلاش میں اور اس کے مطلب کی تلاش میں۔ حالاں کہ ان کا مطلب اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ اور جو لوگ پختہ علم والے ہیں وہ کہتے ہیں کہ ہم ان پر ایمان لائے۔ سب ہمارے رب کی طرف سے ہے۔ اور نصیحت وہی لوگ قبول کرتے ہیں جو عقل والے ہیں۔ (آل عمران ۷)

قرآن کی اس آیت میں متشابہات کا مطلب متماثلات ہے۔ یعنی تمثیلات کی زبان۔ قرآن میں غیب کی باتوں کو تمثیل کی زبان میں واضح کیا گیا ہے اور موجودہ معلوم دنیا کی باتوں کو محکم زبان میں۔

قرآن میں دو طرح کے مضامین ہیں۔ ایک وہ جو انسان کی معلوم و معروف دنیا سے تعلق رکھتے ہیں۔ مثلاً تاریخی واقعات، کائناتی نشانیاں، دنیوی زندگی کے احکام وغیرہ۔ دوسرے وہ جن کا تعلق ان غیبی امور سے ہے جو آج کے انسان کے لئے ناقابل ادراک ہیں۔ مثلاً خدا کی صفات، جنت دوزخ کے احوال، فرشتوں کی نوعیت، وغیرہ۔ پہلی قسم کی باتوں کو قرآن میں محکم انداز، بالفاظ دیگر براہ راست اسلوب میں بیان کیا گیا ہے۔ دوسری قسم کی باتیں انسان کی نامعلوم دنیا سے متعلق ہیں، وہ انسانی زبان کی گرفت میں نہیں آتیں۔ اس لئے ان کو متشابہہ انداز یعنی تمثیل و تشبیہ کے اسلوب میں بیان کیا گیا ہے۔ مثلاً انسان کا ہاتھ کہا جائے تو یہ براہ راست زبان کی مثال ہے اور اللہ کا ہاتھ تمثیلی زبان کی مثال۔

جو لوگ اس فرق کو نہیں سمجھتے وہ متشابہ آیتوں کا مفہوم بھی اس طرح متعین کرنے لگتے

ہیں جس طرح محکم آیتوں کا مفہوم متعین کیا جاتا ہے۔ یہ اپنے فطری دائرہ سے باہر نکلنے کی کوشش ہے۔اس قسم کی کوشش کا انجام اس کے سوااور کچھ نہیں کہ آدمی ہمیشہ بھٹکتا رہے اور کبھی منزل پر نہ پہنچے۔ کیوں کہ "انسان کے ہاتھ" کو متعین طور پر سمجھا جاسکتا ہے۔ مگر "خدا کے ہاتھ" کو موجودہ عقل کے ساتھ متعین طور پر سمجھنا ممکن نہیں۔

قرآن فہمی کا یہ اصول عین فطرت کے اصول کے مطابق ہے۔ انسان کو ہر معاملے میں یہی کرنا پڑتا ہے کہ وہ کچھ باتوں کو کامل طور پر جاننے کی کوشش کرے،اور کچھ دوسری باتوں کے سلسلے میں اجمالی علم پر اکتفا کرے۔ یہی عام اصول قرآن کو سمجھنے کے لئے بھی ضروری ہے۔ جو لوگ اس اصول کو ملحوظ نہ رکھیں وہ قرآن کو پڑھ کر اس سے صرف ذہنی انتشار کی غذا حاصل کریں گے ،وہ اس سے حقیقی استفادہ نہیں کر سکتے۔

3-011

خدا کا عطیہ

قرآن میں جس طرح عبادت کے احکام ہیں اسی طرح قرآن میں تاریخ میں تبدیلی کے قوانین بھی بتائے گئے ہیں۔ اس سلسلے میں قرآن کا ایک حصہ یہ ہے: تم کہو کہ اے اللہ، سلطنت کے مالک، تو جس کو چاہے سلطنت دے اور جس سے چاہے سلطنت چھین لے۔ اور تو جس کو چاہے عزت دے اور جس کو چاہے ذلیل کرے۔ تیرے ہاتھ میں ہے سب خوبی۔ بے شک تو ہر چیز پر قادر ہے۔ تو رات کو دن میں داخل کرتا ہے اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے۔ اور تو بے جان سے جان دار نکالتا ہے اور تو جاندار سے بے جان کو نکالتا ہے۔ اور تو جس کو چاہتا ہے بے حساب رزق دیتا ہے۔ (آل عمران ۲۶-۲۷)

قرآن کی یہ آیت انسانی تاریخ کے بارے میں ایک اہم خدائی قانون کو بتاتی ہے۔ اور وہ یہ کہ دنیا میں کسی کو اقتدار کا ملنا اور کسی سے اقتدار کا چھن جانا دونوں تمام تر خدا کے فیصلے کے تحت ہوتے ہیں۔ جس طرح زمین پر رات اور دن کا آنا تمام تر خدائی نظام کے تحت ہوتا ہے اسی طرح

اقتدار کا بھی کسی سے چھننا اور کسی کو دیا جانا تمام تر خدائی معاملہ ہے نہ کہ محض ایک انسانی معاملہ۔

اس دنیا میں اقتدار کو نشانہ بنا کر مہم چلانا ایسا ہی ہے جیسے رات اور دن کے نظام کو بدلنے کے لئے مہم چلانا۔ اقتدار کے نظام میں تبدیلی خدائی مصلحتوں کے تحت ہوتی ہے نہ کہ انسانی کوششوں کے تحت۔ ایسی حالت میں آدمی کو چاہئے کہ وہ اپنے حاصل شدہ دائرہ میں اپنی ذمہ داریوں کو ادا کرے، اور اقتدار کے دائرہ میں قناعت کے اصول کو اختیار کرے۔

ہر قسم کی عزت و طاقت اللہ کے اختیار میں ہے۔ وقت کے بڑے جس کو بے حقیقت سمجھ لیں، خدا چاہے تو اسی کے حق میں عزت و سربلندی کا فیصلہ کر دے۔ علم کی گدیوں پر بیٹھنے والے جس کے جہل کا فتویٰ دیں، خدا چاہے تو اسی کے ذریعہ علم کا چشمہ جاری کر دے۔ خدا کی نظر میں اگر کوئی عزت و طاقت کا مستحق ہو سکتا ہے تو وہ جو اس کو خالص خدا کی چیز سمجھے اور خدا کی نظر میں اس کا سب سے زیادہ غیر مستحق اگر کوئی ہے تو وہ جو اس کو اپنی ذاتی ملکیت سمجھ لے۔

خدا وسیع تر کائنات میں روزانہ بہت بڑے پیمانہ پر یہ کرشمہ دکھا رہا ہے کہ وہ تاریکی کو روشنی کے اوپر اوڑھا دیتا ہے اور روشنی کو تاریکی کے اوپر ڈال دیتا ہے۔ وہ مردہ عناصر سے زندگی وجود میں لاتا ہے اور زندہ چیزوں کو مردہ عناصر میں تبدیل کرتا ہے۔ خدا کی یہی قدرت اگر انسانی تاریخ میں ظاہر ہو تو اس میں تعجب کی کیا ضرورت۔

3-012

ربّانی بنو

قرآن میں ارشاد ہوا ہے: کسی انسان کا یہ کام نہیں کہ اللہ اس کو کتاب اور حکمت اور نبوت دے اور وہ لوگوں سے یہ کہے کہ تم اللہ کو چھوڑ کر میرے بندے بن جاؤ بلکہ وہ تو کہے گا کہ تم اللہ والے بنو اس واسطے کہ تم دوسروں کو کتاب کی تعلیم دیتے ہو اور خود بھی اس کو پڑھتے ہو۔ (آل عمران ۷۹)

اس آیت کے مطابق خدا کے پیغمبروں نے انسان کو جو تعلیم دی وہ یہ تھی کہ اے لوگو! تم لوگ ربانی بنو۔ ربانی کا مطلب ہے رب والا۔ یہ لفظ قرآن میں اس انسان کے لئے استعمال ہوا ہے

جو غیر خدا پرستانہ زندگی کو چھوڑ کر خدا پرستانہ زندگی اختیار کرے، جو غیر اللہ میں جینے کے بجائے صرف اللہ میں جینے لگے۔ جس کے صبح وشام صرف آخرت کی یاد میں بسر ہوں نہ کہ ان دنیوی اور مادی چیزوں میں جن کے درمیان موجودہ زندگی میں آدمی کو رہنا پڑتا ہے۔

عام انسان کی غذا اگر مادیت ہے تو ربانی انسان کی غذا روحانیت۔ عام انسان کی دلچسپیاں اگر ظاہری چیزوں میں بکھری ہوئی ہوتی ہیں تو ربانی انسان اعلیٰ حقیقتوں کو اپنی دلچسپی کا مرکز بناتا ہے۔ عام انسان اگر مخلوقات میں جیتا ہے تو ربانی انسان خالق کائنات میں۔

ربانی انسان کو تواضع میں لذت ملتی ہے نہ کہ فخر میں۔ ربانی انسان معاف کرنے کو محبوب سمجھتا ہے نہ کہ انتقام لینے کو۔ ربانی انسان کو سادگی پسند ہوتی ہے نہ کہ نمائش اور تکلف۔ ربانی انسان پچھلی سیٹ پر بیٹھنا پسند کرتا ہے نہ کہ اگلی سیٹ پر۔ ربانی انسان وہ ہے جو بولے کم اور سوچے زیادہ۔ جو دوسروں کے احتساب سے زیادہ اپنے احتساب میں دلچسپی رکھتا ہو۔ جس کو پانے میں خوشی نہ ہو اور کھونا جس کو غمگین نہ کرے۔ جس کی توجہات کا مرکز کل والی دنیا ہو نہ کہ آج والی دنیا۔

3-013

اسلامی روحانیات

اسلام کے مطابق، روحانیت کا سرچشمہ کسی پر اسرار قسم کی ورزش یا عملیات میں نہیں ہے بلکہ اس کا سرچشمہ حقائق عالم میں غور و فکر ہے۔ غور و فکر کے ذریعہ آدمی یہاں ایسے فیضانات حاصل کرتا ہے جو اس کے اندر روحانی تموج پیدا کریں اور اس کو مادی انسان سے اٹھا کر روحانی انسان بنادیں۔ یہ حقیقت قرآن کی ان آیتوں سے معلوم ہوتی ہے:

آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں اور رات دن کے باری باری آنے میں عقل والوں کے لئے نشانیاں ہیں۔ جو کھڑے اور بیٹھے اور اپنی کروٹوں پر اللہ کو یاد کرتے ہیں اور آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں غور کرتے رہتے ہیں۔ وہ کہہ اٹھتے ہیں اے ہمارے رب تو نے یہ سب بے مقصد نہیں بنایا۔ تو پاک ہے، پس ہم کو آگ کے عذاب سے بچا۔ اے ہمارے رب تو نے جس کو آگ

میں ڈالا اس کو تو نے واقعی رسوا کر دیا۔ اور ظالموں کا کوئی مددگار نہیں۔ اے ہمارے رب ہم نے ایک پکارنے والے کو سنا جو ایمان کی طرف پکار رہا تھا کہ اپنے رب پر ایمان لاؤ۔ پس ہم ایمان لائے۔ اے ہمارے رب ہمارے گناہوں کو بخش دے اور ہماری برائیوں کو ہم سے دور کر دے اور ہمارا خاتمہ نیک لوگوں کے ساتھ کر۔ اے ہمارے رب تو نے جو وعدے اپنے رسول کی معرفت ہم سے کئے ہیں ان کو ہمارے ساتھ پورا کر اور قیامت کے دن ہم کو رسوائی میں نہ ڈال۔ بے شک تو اپنے وعدے کے خلاف کرنے والا نہیں۔ (آل عمران ۱۹۰۔ ۱۹۴)

اسلام کے مطابق، روحانیت کسی پر اسرار دنیا میں گم ہونے کا نام نہیں ہے اور نہ وہ ایک ایسی تلاش ہے جو خود اپنی ذات سے شروع ہوتی ہے اور اپنی ذات ہی پر ختم ہو جاتی ہے۔ اس کے برعکس اسلامی روحانیت یہ ہے کہ آدمی حقیقت خداوندی کا زندہ عرفان حاصل کرے۔ وہ حقیقتوں کی ابدی دنیا میں اپنے لئے ایک باشعور مقام پالے۔ اسلامی روحانیت کا سفر معلوم راستوں سے ہو کر گزرتا ہے نہ کہ نامعلوم وادیوں سے۔

کائنات اپنے پورے وجود کے ساتھ ایک خاموش اعلان ہے۔ آدمی جب اپنے کان اور آنکھ سے مصنوعی پردوں کو ہٹاتا ہے تو وہ اس خاموش اعلان کو ہر طرف سننے اور دیکھنے لگتا ہے۔ اب اس کو ناممکن نظر آتا ہے کہ ایک ایسی کائنات جس کے ستارے اور سیارے کھربوں سالوں تک بھی ختم نہیں ہوتے وہاں انسان اپنی تمام خواہشوں اور تمناؤں کو لئے ہوئے صرف پچاس سال اور سو سال میں ختم ہو جائے۔ ایک ایسی دنیا جہاں درختوں کا حسن اور پھولوں کی لطافت ہے۔ جہاں ہوا اور پانی اور سورج جیسی بے شمار بامعنی چیزوں کا اہتمام کیا گیا ہے وہاں انسان کے لئے حزن اور غم کے سوا کوئی اور انجام نہ ہو۔

پھر یہ بھی اس کو ناممکن نظر آتا ہے کہ ایک ایسی دنیا جہاں یہ اتھاہ امکان رکھا گیا ہے کہ یہاں ایک چھوٹا سا بیج زمین میں ڈالا جائے تو اس کے اندر سے ہرے بھرے درخت کی ایک پوری کائنات نکل آئے۔ وہاں آدمی نیکی کی زندگی اختیار کر کے بھی اس کا کوئی پھل نہ پاتا ہو۔ ایک ایسی

دنیا جہاں ہر روز تاریک رات کے بعد روشن دن آتا ہے وہاں صدیاں گزر جائیں اور عدل وانصاف کا اجالا اپنی چمک نہ دکھائے۔ ایک ایسی دنیا جس کی گود میں زلزلے اور طوفان سو رہے ہیں وہاں انسان ظلم پر ظلم کر تا رہے مگر کوئی اس کا ہاتھ پکڑنے والا سامنے نہ آئے۔

جو لوگ حقیقتوں میں جیتے ہیں اور گہرائیوں میں اتر کر سوچتے ہیں ان کے لئے نا قابل یقین ہو جاتا ہے کہ ایک بامعنی کائنات بے معنی انجام پر ختم ہو جائے۔ غور و فکر کے بعد وہ جان لیتے ہیں کہ حق کا داعی جو پیغام دے رہا ہے وہ نطق کی زبان میں اسی بات کا اعلان ہے جو خاموش زبان میں ساری کائنات میں نشر ہو رہا ہے۔ ان کے لئے سب سے بڑا مسئلہ یہ بن جاتا ہے کہ جب سچائی کھلے اور جب انصاف کا سورج نکلے تو اس دن وہ ناکام و نامراد نہ ہو جائیں۔ وہ اپنے رب کو پکارتے ہوئے اس کی طرف دوڑ پڑتے ہیں، وہ مفاد اور مصلحت کی تمام حدوں کو توڑ کر داعیٔ حق کے ساتھ ہو جاتے ہیں تاکہ جب کائنات کا "اجالا" اور کائنات کا "اندھیرا" ایک دوسرے سے الگ کئے جائیں تو کائنات کا مالک ان کو اجالے میں جگہ دے، وہ ان کو اندھیرے میں ٹھوکریں کھانے کے لئے نہ چھوڑے۔

یہ ذہنی دریافت آدمی کی پوری زندگی کو بدل دیتی ہے۔ اب وہ ایک نیا انسان بن جاتا ہے، ایک ایسا انسان جو دنیا میں بامعنی زندگی کی تعمیر کرے اور آخرت میں بھی اپنے لئے ایک بامعنی زندگی حاصل کر لے۔

4-014

شرک نا قابلِ معافی

اسلام میں گناہ کا یہ تصور نہیں کہ ایک بار اس کا ارتکاب کرنے کے بعد اس کی معافی نہیں ہو سکتی۔ اسلام کے مطابق، توبہ اور اعتراف کے بعد ہر گناہ معاف ہو جاتا ہے۔ البتہ شرک ایک ایسا گناہ ہے جو خدا کے یہاں قابل معافی نہیں۔ قرآن میں ارشاد ہوا ہے:

بے شک اللہ اس کو نہیں بخشے گا کہ اس کے ساتھ شرک کیا جائے۔ لیکن اس کے علاوہ جو

کچھ ہے اس کو جس کے لئے چاہے گا بخش دے گا۔ اور جس نے اللہ کا شریک ٹھہرایا اس نے بڑا طوفان باندھا۔ (النساء ۴۸)

شرک کیا ہے۔ شرک یہ ہے کہ ان چیزوں میں کسی کو اللہ کا شریک اور ہم سر ٹھہرایا جائے۔ جو صرف خدا کے لئے خاص ہیں۔ مثلاً کائنات کی تخلیق اللہ نے تنہا اپنی قدرت سے کی ہے۔ اب اگر کوئی شخص تخلیق کے اس عمل میں کسی اور کو شامل کرے تو وہ شرک ہوگا۔ اللہ کائنات کے نظام کو تنہا چلا رہا ہے۔ اب اگر کوئی شخص کسی اور کو بھی کائنات کے نظام میں متصرف مانے تو یہ شرک ہوگا۔ ہر قسم کا اختیار حقیقی طور پر صرف ایک اللہ کو حاصل ہے۔ اب اگر کوئی مانے کہ ان اختیارات میں کوئی اور بھی حصہ دار ہے تو یہ شرک ہوگا۔ انسان کو دنیا میں جو مختلف قسم کا رزق ملتا ہے وہ تمام تر اللہ کی طرف سے ہوتا ہے۔ اب اگر کوئی شخص سمجھے کہ کوئی اور بھی ہے جو رزق رسانی کا اختیار رکھتا ہے تو یہ شرک ہوگا۔

اسی طرح الٰہ یا معبود کا درجہ صرف ایک خدا کو حاصل ہے۔ اب اگر کوئی شخص کسی اور کو معبود مانے تو یہ شرک ہوگا۔ اسی طرح عبادت کی قسم کے تمام اعمال صرف ایک خدا کا حق ہیں۔ اب اگر کوئی شخص خدا کے ساتھ کسی اور کی عبادت کرنے لگے تو یہ خدا کے ساتھ شرک ہوگا۔ اسی طرح قرآن کے مطابق، حُبِّ شدید اور خوفِ شدید بھی صرف ایک خدا کا حق ہے۔ اب اگر کوئی شخص ایک خدا کے سوا کسی اور کی حُبِّ شدید یا خوف شدید میں مبتلا ہو جائے تو یہ بھی شرک جیسا ایک عمل ہوگا، وغیرہ۔

شرک نا قابل معافی کیوں ہے۔ اس لئے کہ یہ خدا کی دنیا میں کسی اور کو خدائی کا درجہ دینا ہے۔ یہ خدا کے غیر مشترک حقوق میں کسی اور کو حصہ دار بنانا ہے۔ یہ قرآن کے لفظوں میں کسی اور کو خدا کے ساتھ اس کا ندّ (ہمسر) ٹھہرانا ہے۔ اس قسم کا فعل اپنی نوعیت کے اعتبار سے عین وہی چیز ہے جس کو عام دنیوی اصطلاح میں ریاست سے غداری (treason) یا ریاست سے بغاوت (rebellion) کہا جاتا ہے۔ غداری اور بغاوت جس طرح دنیوی سلطان کے یہاں نا قابل

معافی جرم سمجھے جاتے ہیں، اسی طرح سلطان حقیقی کے یہاں بھی اس قسم کا فعل ناقابل معافی جرم کی حیثیت رکھتا ہے۔ شرک بلاشبہہ اللہ کی سب سے بڑی ناقدری ہے۔ اللہ بشری تقاضے کے تحت پیش آنے والے کسی گناہ کو معاف کر سکتا ہے مگر جو لوگ جان بوجھ کر خدا کی ناقدری کی جسارت کریں وہ یقیناً قابل معافی نہیں ہو سکتے۔

4-015

تحاکم الی الطاغوت

قرآن میں اہل ایمان کو خطاب کرتے ہوئے یہ حکم دیا گیا: اے ایمان والو، اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو اور اپنے میں اہل اختیار کی اطاعت کرو۔ پھر اگر تمہارے درمیان کسی چیز میں اختلاف ہو جائے تو اس کو اللہ اور رسول کی طرف لوٹاؤ، اگر تم اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہو۔ یہ بات اچھی ہے اور اس کا انجام بہتر ہے۔ کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ ایمان لائے ہیں اس پر جو اتارا گیا ہے تمہاری طرف اور جو اتارا گیا ہے تم سے پہلے، وہ چاہتے ہیں کہ قضیہ لے جائیں طاغوت کی طرف، حالاں کہ ان کو حکم دیا گیا ہے کہ اس کو نہ مانیں اور شیطان چاہتا ہے کہ ان کو بہکا کر بہت دور ڈال دے۔ (النساء ۵۹۔۶۰)

اس آیت میں طاغوت سے مراد قدیم مدینہ کا یہودی سردار کعب بن اشرف ہے۔ (تفسیر القرطبی ۵/ ۲۶۳) اصل یہ ہے کہ مدنی دور کے ابتدائی سالوں میں وہاں اسلام کا کامل اقتدار قائم نہیں ہوا تھا۔ ایک طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات تھی جن کے پاس لوگ اپنے نزاعات اور مقدمات کا فیصلہ لینے کے لئے آتے تھے۔ دوسری طرف کعب بن اشرف تھا جس کو وہاں عرصہ سے ایک قسم کی عدالتی حیثیت حاصل ہو گئی تھی۔ جب بھی مدینہ (یثرب) کے دو آدمیوں میں نزاع قائم ہوتی تو دونوں کعب بن اشرف کے پاس آتے اور اس سے اپنے نزاع کا فیصلہ کراتے۔

اس زمانے میں بعض ایسے واقعات ہوئے جب کہ کسی کمزور مسلمان نے اپنے مقدمے

کے فیصلہ کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑ کر کعب بن اشرف کی طرف رجوع کیا، اس امید میں کہ وہ وہاں اپنی مرضی کے موافق فیصلہ لے سکے گا۔ اس پر یہ آیت اتری اور کہا گیا کہ جو مسلمان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑ کر کعب بن اشرف کے یہاں اپنا مقدمہ لے جاتے ہیں وہ شیطان کی پیروی کر رہے ہیں۔

موجودہ زمانے میں یہ قرآنی حکم ان تمام ملکوں پر چسپاں ہوتا ہے جہاں سیکولر عدالتیں قائم ہیں۔ ان ملکوں کے مسلمانوں کے درمیان جب بھی کوئی نزاع قائم ہو، خواہ وہ مالی ہو یا غیر مالی، تو ان پر فرض کے درجہ میں ضروری ہے کہ وہ اپنے نزاعی معاملے کا فیصلہ قرآن وسنت سے کرائیں۔ یعنی ان ملکوں کے دار الافتاء یا دار القضاء یا علماء کی مجلس کے سامنے مقدمہ پیش کیا جائے اور وہ قرآن وسنت کی روشنی میں جو فیصلہ دیں اس کو دونوں فریق بے چون وچرا مان لیں۔ ان ملکوں کے مسلمان اگر ایسا نہ کریں بلکہ وہ اپنے مقدمات اور نزاعات کو سیکولر عدالتوں میں لے جائیں اور وہاں سے اپنی مرضی کے مطابق فیصلے حاصل کریں تو ایسے مسلمان بلاشبہہ مذکورہ آیت کا مصداق ہوں گے۔

یہ آیت سیاسی معنی میں نہیں ہے یعنی اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مسلمان ہر جگہ اسلامی حکومت قائم کریں اور اس کے تحت شرعی عدالت کا نظام بنائیں تاکہ ان کے مقدمات کا فیصلہ شریعت کی روشنی میں کیا جاسکے۔ اس آیت کا تعلق حاکمانہ نفاذ قانون سے نہیں ہے بلکہ خود اپنی رغبت سے اسلامی حکم کو تسلیم کرنے سے ہے۔ چنانچہ یہ آیت ہر جگہ قابل عمل ہے۔ اسلامی حکومت میں اسلامی عدالتوں کے ذریعہ۔ اور جہاں اسلامی حکومت نہ ہو وہاں علماء اسلام کی مجلس فتویٰ یا مجلس قضاء کے ذریعہ۔

جس ملک میں اسلامی حکومت قائم ہو وہاں کے لئے اس قرآنی حکم کا مطلب یہ ہوگا کہ مسلمانوں کے اوپر حاکمانہ طاقت کے ذریعہ اسلامی قانون کا نفاذ کیا جائے۔ اور جہاں اسلامی حکومت قائم نہ ہو وہاں بھی یہ اسلامی حکم بدستور مطلوب رہے گا، صرف اس فرق کے ساتھ کہ اسلامی حکومت میں اگر اس کا نفاذ حاکمانہ طاقت سے کیا جائے گا تو غیر اسلامی حکومت میں ہر مسلمان پر یہ

فرض ہوگا کہ وہ رضاکارانہ طور پر خود اپنی مرضی سے اس کو اپنے اوپر عائد کرے۔

4-016

یکساں محاسبہ

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ آخرت میں انسانوں کا جو محاسبہ ہوگا اس میں ایک اور دوسرے کے درمیان کوئی فرق نہیں کیا جائے گا، بلکہ ایک ہی اصول انصاف کی بنیاد پر سب کا حساب ہوگا۔ قرآن میں ارشاد ہوا ہے: نہ تمہاری آرزوؤں پر ہے اور نہ اہل کتاب کی آرزوؤں پر۔ جو کوئی بھی برا کرے گا وہ اس کا بدلہ پائے گا۔ اور وہ نہ پائے گا اللہ کے سوا اپنا کوئی حمایتی اور نہ کوئی مددگار۔ اور جو شخص کوئی نیک کام کرے گا، خواہ وہ مرد ہو یا عورت بشرطیکہ وہ مومن ہو، تو ایسے لوگ جنت میں داخل ہوں گے اور ان پر ذرا بھی ظلم نہ ہوگا۔ (النساء۔ ۱۲۳۔ ۱۲۴)

پیغمبر کی دعوتی جدوجہد کے نتیجے میں جو لوگ اس پر ایمان لاتے ہیں، وہ پیغمبر کی امت کہے جاتے ہیں۔ اس امت کی پہلی نسل کے افراد کا ایمان زندہ ایمان ہوتا ہے۔ ان کی زندگی عمل صالح کا نمونہ ہوتی ہے۔ مگر امت کی بعد کی نسلوں میں ایمان و عمل کا جذبہ کمزور ہو جاتا ہے۔ اب وہ عمل کے بجائے آرزوؤں اور خوش گمانیوں میں جینے لگتے ہیں۔ وہ ذاتی عمل کے بجائے پیغمبر کی امت سے گروہی وابستگی ہی کو نجات کے لئے کافی سمجھ لیتے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور سے پہلے یہود کا یہی حال ہو چکا تھا جو اپنے آپ کو موسیٰ کی امت سمجھتے تھے۔ تاہم یہ صرف یہود کی صفت نہیں ہے بلکہ وہ اس زوال کا نتیجہ ہے جو ہر امت پر لازماً پیش آتا ہے اور قرآن اور حدیث کے بیان کے مطابق خود امت مسلمہ پر بھی پیش آنے والا ہے۔ قرآن کی یہ آیت بتاتی ہے کہ اس معاملہ میں خود مسلمانوں کے ساتھ بھی خدا کا قانون وہی ہے جو کہ یہود کے ساتھ تھا۔

امت مسلمہ کے ساتھ بھی یہی پیش آئے گا کہ پہلی نسل میں اس کے افراد زندہ ایمان کے حامل ہوں گے۔ ان کا سارا انحصار عمل صالح پر ہوگا۔ ان کی ساری توجہ اس پر رہے گی کہ وہ

دنیامیں سچے ایمان اور حقیقی عمل کا ثبوت دیں تاکہ آخرت میں وہ خدا کی عدالت میں خدا کی رحمتوں کے مستحق قرار پائیں۔ مگر بعد کی نسلوں میں جب وہ زوال کے شکار ہوں گے تو یہ صورت حال بالکل بدل جائے گی۔

اب آخرت کی کامیابی کو پانے کے لئے صرف خوش فہمیاں ان کو کافی نظر آنے لگیں گی۔ ان کے درمیان طرح طرح کے پراسرار عقیدے پیدا ہو جائیں گے جن کی کوئی اصل قرآن و سنت میں نہ ہوگی۔ مگر جھوٹے قصے کہانیوں اور مفروضہ بزرگوں کے خوش نما اقوال کی بنیاد پر وہ ان پر اس طرح یقین کر لیں گے جیسے کہ وہ براہِ راست آسمان سے ان کے اوپر اتاری گئی ہیں۔ کچھ ظاہری اعمال، کسی بزرگ کی سفارش، کسی بڑے گروہ سے وابستگی، کچھ پاک کلمات کا ورد، حتی کہ نعت خوانی اور قبروں کی زیارت، بس اس قسم کے سستے اور نمائشی اعمال سے وہ یہ امید قائم کر لیں گے کہ وہ ان کو جہنم سے بچانے کے لئے کافی ہو جائیں گے اور ان کو یقینی طور پر جنت کی پر بہار باغوں میں داخل کر دیں گے۔ مگر قرآن کے مطابق، یہ سب بے بنیاد خوش فہمیاں ہیں جو نہ یہود کے کام آنے والی ہیں اور نہ مسلمانوں کے کام آنے والی۔

اس قسم کی خوش خیالیاں خواہ ان کو کتنے ہی خوب صورت الفاظ میں بیان کیا گیا ہو، وہ خدا کی میزان عدل میں سراسر بے حقیقت ہیں۔ اللہ کا نظام حد درجہ محکم نظام ہے۔ اس کے یہاں تمام فیصلے حقیقتوں کی بنیاد پر ہوتے ہیں نہ کہ محض آرزوؤں کی بنیاد پر۔ اللہ کی عدالت میں ہر آدمی کا اپنا عمل دیکھا جائے گا اور جیسا جس کا عمل ہوگا ٹھیک اسی کے مطابق اس کا فیصلہ ہوگا۔ اللہ کے قانون عدل کے سوا کوئی بھی دوسری چیز نہیں جو اللہ کے یہاں فیصلہ کی بنیاد بننے والی ہو۔

4-017

عادلانہ زندگی

قرآن میں اہل ایمان کو خطاب کرتے ہوئے ارشاد ہوا ہے: اے ایمان والو انصاف پر خوب قائم رہنے والے اور اللہ کے لئے خوب گواہی دینے والے بنو، چاہے وہ تمہارے یا تمہارے ماں باپ

یا عزیزوں کے خلاف ہو۔ اگر کوئی مال دار ہے یا محتاج تو اللہ تم سے زیادہ دونوں کا خیر خواہ ہے۔ پس تم خواہش کی پیروی نہ کرو کہ حق سے ہٹ جاؤ۔ اور اگر تم کجی کرو گے یا پہلو تہی کرو گے تو جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ اس سے باخبر ہے۔ (النساء ۱۳۸)

اس آیت کا مطلب یہ نہیں ہے کہ دنیا میں عدل کا نظام یا عدل کی حکومت قائم کرو۔ یہ کوئی سیاسی آیت نہیں ہے۔ اس کا خطاب تمام تر فرد سے ہے۔ یہ آیت بتاتی ہے کہ فرد مسلم دنیا میں کس طرح رہے۔ اس کے مطابق، ہر شخص کو چاہئے کہ اپنی ذاتی زندگی کو عدل وانصاف کے اصول پر قائم کرے۔ اس معاملے میں وہ اپنا نگراں آپ بن جائے۔

انسان کی زندگی میں بار بار ایسا ہوتا ہے کہ اس کے سامنے ایسا معاملہ آتا ہے جس میں ایک راستہ اپنے مفاد اور خواہش کا ہوتا ہے اور دوسرا حق اور انصاف کا۔ جو لوگ اللہ کی طرف سے غافل ہوتے ہیں، جن کو یقین نہیں ہوتا کہ اللہ ہر وقت ان کو دیکھ رہا ہے وہ ایسے موقع پر اپنی خواہش کے رخ پر چل پڑتے ہیں۔ وہ اس کو کامیابی سمجھتے ہیں کہ حق کی پرواہ نہ کریں اور معاملہ کو اپنے مفاد اور اپنی مصلحت کے مطابق طے کریں۔ مگر جو آدمی اللہ سے ڈرتا ہے، جو اللہ کو اپنا نگراں بنائے ہوئے ہے وہ تمام تر انصاف کے پہلو کو دیکھتا ہے اور وہی کرتا ہے جو حق وانصاف کا تقاضا ہو۔ اس کی کوشش ہمیشہ یہ ہوتی ہے کہ اس کو موت آئے تو اس حال میں کہ اس نے کسی کے ساتھ بے انصافی نہ کی ہو، وہ اپنے آپ کو مکمل طور پر قسط اور عدل پر قائم کئے ہوئے ہو۔

ایسے آدمی کی انصاف پسندی کا جذبہ اتنا بڑھا ہوتا ہے کہ اس کے لئے ناممکن ہو جاتا ہے کہ وہ انصاف سے ہٹا ہوا کوئی رویہ دیکھے اور اس کو برداشت کر لے۔ جب بھی ایسا کوئی معاملہ سامنے آتا ہے کہ ایک شخص دوسرے کے ساتھ ناانصافی کر رہا ہو تو وہ ایسے موقع پر حق کا اعلان کرنے سے باز نہیں رہتا۔ اگر انصاف کا اعلان کرنے میں اس کے قریبی تعلق والوں پر زد پڑتی ہو یا اس کی اپنی مصلحتیں مجروح ہوتی ہوں تب بھی وہ وہی کہتا ہے جو انصاف کی رو سے اسے کہنا چاہئے۔ اس کی زبان کھلتی ہے تو اللہ کے لئے کھلتی ہے نہ کہ کسی اور چیز کے لئے۔ اسی طرح یہ بات

بھی خلاف عدل ہے کہ صاحب معاملہ طاقت ور ہو تو اس کو اس کا حق دیا جائے اور اگر صاحب معاملہ کمزور ہو تو اس کا حق اس کو نہ دیا جائے۔ مومن وہ ہے جو ہر آدمی کے ساتھ انصاف کرے خواہ وہ زور آور ہو یا کمزور۔

جب کوئی آدمی ناانصافی کا ساتھ دے تو وہ یہ کہہ کر ایسا نہیں کرتا کہ میں ناانصافی کرنے والے کا ساتھی ہوں۔ بلکہ وہ اپنی ناانصافی کو انصاف کا رنگ دینے کی کوشش کرتا ہے۔ اس مقصد کے لئے وہ دو میں ایک رویہ اختیار کرتا ہے۔ یا تو وہ یہ کرتا ہے کہ اصل بات کو بدل دیتا ہے۔ وہ معاملہ کی نوعیت کو ایسے الفاظ میں بیان کرتا ہے جس سے ظاہر ہو کہ یہ ناانصافی کا معاملہ نہیں بلکہ عین انصاف کا معاملہ ہے، جس کے ساتھ زیادتی کی جارہی ہے وہ اسی کا مستحق ہے کہ اس کے ساتھ ایسا کیا جائے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ آدمی خاموشی اختیار کرلے۔ یہ جانتے ہوئے کہ یہاں ناانصافی کی جارہی ہے۔ وہ اس کے معاملے میں غیر جانب دار بن جائے۔ اور جو کہنے کی بات ہے اس کو وہ زبان پر نہ لائے۔ اس قسم کا طرز عمل ثابت کرتا ہے آدمی اپنے اوپر اللہ کو نگراں نہیں سمجھتا۔ وہ اس آنے والے دن سے بے فکر ہے جب کہ خدا اس کو پکڑے گا اور اس سے اس کے قول اور فعل کا حساب لے گا۔

5-018

استحکامِ دین

ہجرت کے دسویں سال قرآن کی وہ آیت اتری جس کو تکمیل دین کی آیت کہا جاتا ہے۔ وہ آیت یہ ہے: **الیوم یئس الذین کفروا من دینکم فلا تخشوھم واخشونِ ط الیوم اکملت لك دینکم و اتممت علیکم نعمتی و رضیت لکم الاسلام دیناً** (المائدہ ۳)

یعنی آج انکار کرنے والے لوگ تمہارے دین کی طرف سے مایوس ہو گئے۔ پس تم ان سے نہ ڈرو، صرف مجھ سے ڈرو۔ آج میں نے تمہارے لئے تمہارے دین کو کامل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور تمہارے لئے اسلام کو دین کی حیثیت سے پسند کر لیا۔

اس آیت میں تکمیل سے مراد فہرست احکام کی تکمیل نہیں ہے۔ کیوں کہ یہ ثابت ہے کہ اس آیت کے نزول کے بعد بھی قرآن میں کئی احکام اترے۔ (**الجامع لاحکام القرآن للقرطبی،٦/ ٦٢**)

مزید یہ کہ اس آیت میں تکمیل دین کا فائدہ بتاتے ہوئے یہ نہیں کہا گیا کہ اب تم کو ہر حکم قرآن میں مل جائے گا کیوں کہ سارے ممکن احکام قرآن میں اتار دئے گئے ہیں۔ بلکہ اس کے بجائے یہ کہا گیا کہ اب منکرین اور مخالفین اس سے مایوس ہو چکے ہیں کہ وہ تمہارے خلاف کچھ کر سکیں۔ اب تمہارے لئے خشیت (ڈر) کا مسئلہ خدا کی طرف سے ہے نہ کہ انسانوں کی طرف سے۔

اس سے معلوم ہوا کہ یہاں تکمیل دین سے مراد دین کا استحکام ہے نہ کہ فہرست احکام کی تکمیل ۔ جب یہ آیت اتری اس وقت مکہ فتح ہو چکا تھا اور عرب کے تمام قبائل مدینہ کی اسلامی ریاست کے تحت آ چکے تھے۔ مشرک کی مغلوبیت اور توحید کے غلبہ کا مقصد پوری طرح حاصل ہو چکا تھا۔ اس طرح واضح ہو گیا تھا کہ اسلام ایک مستحکم دین کی حیثیت حاصل کر چکا ہے۔ اس سلسلے میں یہاں دو حوالے نقل کئے جاتے ہیں:

وقيل : "اكملت لكم دينكم" بأن اهلكت (لكم) عدوكم و أظهرت دينكم علي الدين كله كما تقول: قد تم لنا ما نريد اذا كفيت عدوك۔(تفسیرالقرطبی٦/ ٦٢)
يئسوا من دينكم ان يغلبوه لان الله تعالى وفي بوعده من اظهاره على الدين كله......
(اكملت لكم دينكم) بأن كفيتم خوف عدوكم و أظهرتكم عليهم كما يقول الملوك اليوم كمل لنا الملك أى كفينا من كنا نخافه(تفسير النسفی ١/ ٢٧٠)

یعنی اللہ نے دین اسلام کو اس طرح کامل کر دیا کہ اسلام کے دشمن ہمیشہ کے لئے مغلوب ہو گئے اور دین اسلام کو تمام دینوں کے اوپر غالب کر دیا۔ اب دشمن تمہارے بارے میں مایوس ہو گئے ہیں کہ وہ اس دین کو مغلوب کر سکیں۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے بادشاہ لوگ کہتے ہیں کہ آج ہمارا

اقتدار مکمل ہو گیا یعنی آج ہمارے دشمنوں سے کوئی خطرہ نہیں رہا۔

دین اسلام کے مستحکم ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اب وہ اس طرح محفوظ ہو چکا ہے کہ اس کی محفوظیت کے لئے اب کوئی خطرہ نہیں ہے۔ دنیا کے انقلابات اب کبھی بھی اسلام کو مٹانے میں کامیاب نہ ہو سکیں گے۔ دنیا کی کوئی بھی علمی ترقی اسلام کی صداقت کو مشتبہ نہ کر سکے گی۔ بعد کے زمانے کی دریافتیں اسلام کی صداقت کو ثابت کرنے والی ہوں گی نہ کہ اس کی تردید کرنے والی۔ ہر دور میں اسلام کو ایسے حامی اور مددگار ملتے رہیں گے جو اس کو ایک سچے دین کی حیثیت سے زندہ رکھیں، وغیرہ۔

قرآن کی یہ آیت قرآن کے کتاب الٰہی ہونے کا ایک کھلا ثبوت ہے۔ کیوں کہ چودہ سو سال پہلے کا ایک اعلان ہر قسم کے اختلاف کے باوجود اپنی معنویت کو باقی رکھے ہوئے ہے۔ یہ اعلان استثنائی طور پر ابدی اعلان بنا ہوا ہے۔

5-019

مومن کی پہچان

قرآن میں اہل ایمان کو خطاب کرتے ہوئے ارشاد ہوا ہے: اور اپنے اوپر اللہ کی نعمت کو یاد کرو اور اس کے اس عہد کو یاد کرو جو اس نے تم سے لیا ہے۔ جب کہ تم نے کہا کہ ہم نے سنا اور ہم نے مانا۔ اے ایمان والو، اللہ کے لئے قائم رہنے والے اور انصاف کے ساتھ گواہی دینے والے بنو۔ اور کسی گروہ کی دشمنی تم کو اس پر نہ ابھارے کہ تم انصاف نہ کرو، انصاف کرو۔ یہی تقویٰ سے زیادہ قریب ہے اور اللہ سے ڈرو بے شک اللہ کو خبر ہے جو تم کرتے ہو۔ (المائدہ ۷۔۸)

ایمان ایک عہد ہے جو بندے اور خدا کے درمیان قرار پاتا ہے۔ بندہ یہ وعدہ کرتا ہے کہ وہ دنیا میں اللہ کی مرضی کے مطابق رہے گا۔ بندے کو اپنے عہد میں پورا اترنے کے لئے دو باتوں کا ثبوت دینا ہے۔ ایک یہ کہ وہ قوام للہ بن جائے۔ یعنی وہ خدا کی باتوں پر خوب قائم رہنے والا ہو۔ اس کا وجود ہر موقع پر صحیح ترین جواب پیش کرے جو بندے کو اپنے رب کے لئے پیش کرنا چاہئے۔

وہ جب کائنات کو دیکھے تو اس کا ذہن خدا کی قدرتوں اور عظمتوں کے تصور سے سرشار ہو جائے۔ وہ جب اپنے آپ کو دیکھے تو اس کو اپنی زندگی سراپا اللہ کا فضل اور اس کا احسان نظر آئے۔ اس کے جذبات امڈیں تو خدا کے لئے امڈیں۔ اس کی توجہات کسی چیز کو اپنا مرکز بنائیں تو خدا کو بنائیں۔ اس کی محبت خدا کے لئے ہو۔ اس کے اندیشے خدا سے وابستہ ہوں۔ اس کی یادوں میں خدا سمایا ہوا ہو۔ وہ خدا کی عبادت و اطاعت کرے۔ خدا کے راستہ میں اپنے اثاثہ کو خرچ کرے۔ وہ اپنے آپ کو خدا کے دین کے راستہ میں لگا کر خوش ہوتا ہو۔

عہد پر قائم رہنے کی دوسری شرط بندوں کے ساتھ انصاف ہے۔ انصاف کا مطلب یہ ہے کہ کسی شخص کے ساتھ کمی بیشی کئے بغیر وہ سلوک کرنا جس کا وہ باعتبار واقعہ مستحق ہے، معاملات میں حق کو اپنانا نہ کہ اپنی خواہشات کو۔ اس معاملہ میں بندے کو اتنا زیادہ پابند بننا ہے کہ وہ ایسے مواقع پر بھی اپنے کو انصاف سے باندھے رہے جب کہ وہ دشمنوں اور باطل پرستوں سے معاملہ کر رہا ہو، جب کہ شکایتیں اور تلخ یادیں اس کو انصاف کے راستہ سے پھیرنے لگیں۔

دنیا میں خدا نشانیوں کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ یعنی ایسے دلائل کی صورت میں جس کی کاٹ آدمی کے پاس موجود نہ ہو۔ جب آدمی کے پاس خدا کی دلیل آئے اور وہ اس کو ماننے کے بجائے اس پر لفظی تکرار کرنے لگے تو اس نے خدا کی نشانی کو جھٹلایا۔ ایسے لوگ خدا کے یہاں سخت سزا پائیں گے۔ اور جن لوگوں نے اس کو مان لیا وہ خدا کے انعام کے مستحق ہوں گے۔

5-020

أمر بالمعروف نھی عن المنکر

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ ـــــــــ بنی اسرائیل میں سے جن لوگوں نے کفر کیا ان پر لعنت کی گئی، داؤد اور ابن مریم کی زبان سے۔ اس لئے کہ انھوں نے نافرمانی کی اور وہ حد سے آگے بڑھ جاتے تھے۔ وہ ایک دوسرے کو منع نہیں کرتے تھے اس برائی سے جو وہ کرتے تھے۔ نہایت برا کام تھا جو وہ کر رہے تھے۔ (المائدہ ۷۸۔۷۹)

لعنت کا مطلب ہے خدا کی رحمت سے دور ہونا۔ قرآن یا حدیث سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ حضرت داؤد یا حضرت مسیح نے بنی اسرائیل سے یہ کہا ہو کہ اے بنی اسرائیل تم پر لعنت ہو، یا یہ کہ تم لوگ ملعون ہو۔ ایسی حالت میں سوال یہ ہے کہ ان پیغمبروں کے ذریعہ بنی اسرائیل پر جو لعنت کی گئی اس کی صورت کیا تھی۔

قرآن وحدیث نیز بائبل کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان پیغمبروں نے یہ کیا کہ ان کو ایکسپوز (expose) کر دیا۔ یعنی وہ اندر سے دینی اسپرٹ سے خالی ہو چکے تھے لیکن اوپر سے وہ دین داری کا شاندار لبادہ اوڑھے ہوئے تھے۔ ان پیغمبروں نے یہ کیا کہ ان کی اس منافقت اور نمائشی دینداری کا پردہ کھول دیا۔ اور انھیں بتایا کہ اس قسم کی بے روح مذہبیت خدا کے یہاں کچھ کام آنے والی نہیں ہے۔

بائبل کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل اپنے زوال کے زمانے میں بالکل بے دین نہیں ہو گئے تھے۔ ان کے یہاں تورات کو پڑھنے اور پڑھانے کے ادارے قائم تھے ان کے یہاں نماز (عبادت) بھی موجود تھی۔ وہ زرعی پیداوار میں عشر نکالتے تھے۔ ان کے علماء عوام کے سامنے مذہبی موضوعات پر خوش نما تقریریں کرتے تھے۔ اس قسم کی بہت سی مذہبی سرگرمیاں ان کے درمیان جاری تھیں۔ مگر انھوں نے ایک خدائی حکم کو بالکل چھوڑ رکھا تھا۔ وہ ہے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر۔ یعنی اپنی قوم کے لوگوں کو برائیوں سے منع کرنا اور انھیں ظلم کو چھوڑ کر عدل کا طریقہ اختیار کرنے کی تلقین کرنا۔

یہودی علماء چاہتے تھے کہ وہ اپنی قوم کے درمیان اچھے بنے رہیں۔ انھیں قوم کے اوپر سیادت حاصل رہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی قوم کے لوگوں کو برائی اور زیادتی کرتے دیکھتے تھے مگر وہ ایسے افراد کی مذمت نہیں کرتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ اپنی قوم کے درمیان برے بھی نہ بنیں اور دین کا کریڈٹ بھی انھیں حاصل رہے۔ مگر قرآن وحدیث کی واضح تصریح کے مطابق ایسا ہونا ممکن نہیں۔ علماء کو اپنی قوم کی زیادتیوں اور ان کی مفسدانہ کارروائیوں کے خلاف اٹھنا ہوگا۔ اس

کے بغیر صرف اوپری قسم کی دین داری یا رواداری انہ قسم کی مذہبیت ان کو خدا کی پکڑ سے بچانے والی نہیں۔

5-021

جنت کی قیمت

قرآن میں ایک صالح گروہ کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد ہوا ہے: اور جب وہ اس کلام کو سنتے ہیں جو رسول پر اتارا گیا ہے تو تم دیکھو گے کہ ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہیں اس سبب سے کہ انھوں نے حق کو پہچان لیا۔ وہ پکار اٹھتے ہیں کہ اے ہمارے رب ہم ایمان لائے۔ پس تو ہم کو گواہی دینے والوں میں لکھ لے۔ اور ہم کیوں نہ ایمان لائیں اللہ پر اور اس حق پر جو ہمیں پہنچا ہے جب کہ ہم یہ آرزو رکھتے ہیں کہ ہمارا رب ہم کو صالح لوگوں کے ساتھ شامل کرے۔ پس اللہ ان کو اس قول کے بدلہ میں ایسے باغ دے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے۔ (المائدہ ۸۳۔۸۵)

ان آیات کے مطابق، اللہ نے مذکورہ گروہ کے لئے جنت کا فیصلہ فرمایا۔ اور یہ فیصلہ ان کے ایک قول کی بنا پر تھا (فاثابهم الله بما قالوا جنت)۔ یہی بات حدیث میں اس طرح آئی ہے کہ جس شخص نے کہا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں وہ جنت میں داخل ہو گا۔ (من قال لا اله الا الله دخل الجنة)

اس آیت میں جنت کو "قول" کا بدلہ قرار دیا گیا ہے۔ مگر وہ قول کیا تھا جس نے اس کے قائلین کو ابدی جنت کا مستحق بنایا۔ وہ قول ان کی پوری ہستی کا نمائندہ تھا۔ وہ ان کی شخصیت کے پھٹنے کی آواز تھا۔ انھوں نے اللہ کے کلام کو اس طرح سنا کہ اس کے اندر جو حق تھا اس کو وہ پوری طرح پا گئے۔ وہ ان کے دل و دماغ میں اتر گیا۔ اس نے ان کے اندر ایسا انقلاب برپا کیا کہ ان کے حوصلوں اور تمناؤں کا مرکز بدل گیا۔ تعصب اور مصلحت کی تمام دیواریں ڈھ پڑیں۔ انھوں نے حق کے ساتھ اپنے آپ کو اس طرح شامل کیا کہ اس سے الگ ان کی کوئی ہستی باقی نہ رہی۔ وہ اس کے گواہ بن گئے، اور گواہ بننا ایک حقیقت کا انسان کی صورت میں مجسم ہونا ہے۔ قرآن اب ان

کے لئے محض ایک کتاب نہ رہابلکہ مالک کائنات کی زندہ نشانی بن گیا۔ یہ ربانی تجربہ جوان پر گزرا بظاہر اس کا اظہار اگر چہ لفظوں کی صورت میں ہوا تھا لیکن ان کے یہ الفاظ الفاظ نہ تھے بلکہ وہ ایک زلزلہ تھا جس نے ان کے پورے وجود کو ہلا دیا۔ حتی کہ ان کی آنکھیں آنسوؤں سے بہہ پڑیں۔

قول اپنی حقیقت کے اعتبار سے کسی قسم کے لسانی تلفظ کا نام نہیں۔ وہ آدمی کے عمل کو معنویت کا روپ دینے کی اعلیٰ ترین صورت ہے جس کا اختیار معلوم کائنات میں صرف انسان کو حاصل ہے۔ ایک حقیقی قول سب سے زیادہ لطیف اور سب سے زیادہ بامعنیٰ واقعہ ہے۔ قول آدمی کی ہستی کا سب سے بڑا اظہار ہے۔ قول گویا ایک ناطق عمل ہے۔ اس لئے جب کوئی شخص قول کی سطح پر اپنی عبدیت کا ثبوت دے دے تو وہ جنت کا یقینی استحقاق حاصل کر لیتا ہے۔

سچا قول بلاشبہ سب سے بڑا عمل ہے۔ انسان جیسی ایک آزاد اور با اختیار مخلوق کی زبان سے ایک حقیقی کلمۂ اعتراف اتنا عظیم ہے کہ زمین و آسمان کی عظمت بھی اس کے برابر نہیں ہو سکتی۔ اس قسم کا ایک قول بندے کی طرف سے اپنے رب کے لئے ایک نادر تحفہ ہے۔ اور جنت اسی نادر تحفہ کا خدائی انعام۔

6-022

قانون التباس

منکرین کے ایک مطالبہ کے جواب میں قرآن میں ارشاد ہوا ہے: اور وہ کہتے ہیں کہ پیغمبر کے اوپر فرشتہ کیوں نہیں اتارا گیا۔ اور اگر ہم کوئی فرشتہ اتارتے تو معاملہ کا فیصلہ ہو جاتا پھر انھیں کوئی مہلت نہ ملتی۔ اور اگر ہم کسی فرشتہ کو رسول بنا کر بھیجتے تو اس کو بھی آدمی بناتے اور ان کو اسی شبہہ میں ڈال دیتے جس میں وہ اب پڑے ہوئے ہیں۔ (الانعام ۸۔۹)

پیغمبر کے معاصرین نے پیغمبر سے کہا کہ آپ کا دعویٰ ہے کہ آپ کے پاس خدا کا فرشتہ خدا کی وحی لے کر آتا ہے تو یہ فرشتہ پوشیدہ طور پر کیوں آتا ہے، اس کو علانیہ طور آپ کے پاس آنا چاہئے تاکہ ہم اس کو دیکھیں اور پھر آپ پر ایمان لانا ہمارے لئے آسان ہو جائے۔ اس کے

جواب میں کہا گیا کہ ایسا نہیں ہو سکتا۔ کیوں کہ اس دنیا میں انسان کا امتحان یہ ہے کہ وہ غیب کی حالت میں رہتے ہوئے ایمان لائے۔ خدا کو وہ ایمان مطلوب ہی نہیں جو سب کچھ دیکھ لینے کے بعد وجود میں آیا ہو۔

اس سنت الٰہی کی بنا پر موجودہ دنیا میں ہر چیز کے ساتھ ایک شبہہ کا عنصر (element of doubt) شامل رکھا گیا ہے۔ خدا کا طریقہ یہ ہے کہ انسان کو حقیقتیں غیر برہنہ صورت میں دکھائی جائیں۔ اور پھر وہ اپنی عقل اور بصیرت کو استعمال کرتے ہوئے ان کو برہنہ صورت میں دریافت کرے اور ان پر ایمان لائے۔

اس دنیا میں دعوت حق کا سارا معاملہ خدا کے قانون التباس پر مبنی ہے۔ یہاں حق کے اوپر شبہہ کا ایک پہلو ہمیشہ باقی رہتا ہے تاکہ آدمی اقرار کے دلائل کے ساتھ کچھ انکار کے وجوہ بھی پا سکتا ہو۔ آدمی کا اصل امتحان یہ ہے کہ وہ اس شبہہ کے پردے کو پھاڑ کر اپنے کو یقین کے مقام پر پہنچائے۔ وہ شبہہ کے پہلوؤں کو حذف کر کے یقین کے پہلوؤں کو لے لے۔ آدمی کا اصل امتحان یہ ہے کہ وہ دیکھے بغیر مانے۔ جب حقیقت کو دکھا دیا جائے تو اس کے بعد ماننے کی کوئی قیمت نہیں۔

انسان موجودہ کائنات میں ایک غیر معمولی قسم کی مخلوق ہے۔ اس کو استثنائی طور پر عقل اور تمیز کی صلاحیت دی گئی ہے۔ وہ اپنی بصیرت سے حق اور ناحق کے درمیان فرق کر سکتا ہے۔ وہ یہ صلاحیت رکھتا ہے کہ ظاہر میں باطن کو دریافت کرے۔ وہ دیکھے بغیر ان چیزوں کو جان لے جو بظاہر دکھائی نہیں دیتیں۔

انسان کی یہ خصوصی صلاحیت اس کی آزمائش کے عین مطابق ہے۔ اس دنیا میں انسان سے عین وہی امتحان لیا جا رہا ہے جس کا اہل بنا کر اس کو پیدا کیا گیا۔ ایسی حالت میں حقیقتوں کے ساتھ شبہہ کا عنصر ہونا انسان کے لئے کوئی عذر نہیں۔ اس کو بہر حال یہ کرنا ہے کہ شبہہ کے باوجود حقیقتوں کو پہچانے۔ جو آدمی اس امتحان میں ناکام ہو جائے اس کو کوئی بھی چیز آخرت کی پکڑ سے بچانے والی نہیں۔

یہ امتحان سب سے زیادہ داعیٔ حق کے معاملہ میں ہوتا ہے۔ حق کا داعی ہمیشہ اپنے ہم زمانہ لوگوں کو ایک عام انسان کے روپ میں دکھائی دیتا ہے۔ اس کی یہ تصویر لوگوں کو اکثر شبہہ میں مبتلا رکھتی ہے۔ داعی کی زندگی اور اس کے کلام میں واضح طور پر یہ ثبوت ہوتا ہے کہ وہ حق کا داعی ہے لیکن لوگ شبہات میں پڑ کر اس کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ داعیٔ حق کے ساتھ اس کے معاصرین کا یہ سلوک بلاشبہہ ایک ناقابل معافی جرم ہے، کوئی بھی عذر انہیں اس کوتاہی سے بری الذمہ کرنے والا نہیں۔

6-023

نتیجہ کی اہمیت

قرآن میں اہل ایمان کو خطاب کرتے ہوئے ارشاد ہوا ہے: اور اللہ کے سوا جن کو یہ لوگ پکارتے ہیں ان کو گالی نہ دو ورنہ یہ لوگ حد سے گزر کر جہالت کی بنا پر اللہ کو گالیاں دینے لگیں گے۔ اسی طرح ہم نے ہر گروہ کی نظر میں اس کے عمل کو خوشنما بنا دیا ہے۔ پھر ان سب کو اپنے رب کی طرف پلٹنا ہے۔ اس وقت اللہ انھیں بتادے گا جو وہ کرتے تھے۔ (الانعام ۱۰۸)

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں ایک ایسا کام کرنا جائز نہیں جو بظاہر درست نظر آئے مگر وہ الٹا نتیجہ پیدا کرنے والا (counter-productive) ہو۔ کسی اقدام کے وقت صرف اس کی اصولی حیثیت نہیں دیکھی جائے گی بلکہ یہ بھی دیکھا جائے گا کہ عملی طور پر اس کا نتیجہ کیا نکلے گا۔ اگر عملی نتیجہ الٹی صورت میں نکلے تو فرض کے درجہ میں ضروری ہوگا کہ اہل ایمان اس سے مکمل طور پر پرہیز کریں۔

مشرکین کے بتوں یا ان کے مذہبی اکابر کو برا کہا جائے تو بظاہر یہ کوئی غلط بات نہیں۔ لیکن کوئی گروہ جب لمبی مدت سے ایک عمل کو مقدس سمجھ کر کر رہا ہو تو اس کے ساتھ اس کی عصبیتیں جڑ جاتی ہیں۔ ایسی حالت میں اگر اہل ایمان ان کو برا کہیں تو وہ مشتعل ہو جائیں گے اور جذبات سے مغلوب ہو کر اسلامی شخصیتوں، حتی کہ خود خدا کو برا کہنے لگیں گے۔ اس لئے اہل ایمان کو چاہئے کہ

وہ اس قسم کی برائی پیدا کرنے کا سبب نہ بنیں۔

ممانعت کا یہ حکم تنقیص یا سب و شتم کے لئے ہے۔ جہاں تک دلیل پر مبنی تنقید و تجزیہ کا تعلق ہے، وہ اسلام میں نہ صرف جائز بلکہ مطلوب ہے۔ قرآن میں اور رسول اللہ کے کلام میں اس کے واضح نمونے موجود ہیں۔

6-024

زندہ انسان

قرآن میں ہدایت پائے ہوئے لوگوں کے بارے میں ارشاد ہوا ہے: کیا وہ شخص جو مردہ تھا پھر ہم نے اس کو زندگی دی اور ہم نے اس کو ایک روشنی دی کہ اس کے ساتھ وہ لوگوں میں چلتا ہے وہ اس شخص کی طرح ہو سکتا ہے جو تاریکیوں میں پڑا ہے، وہ اس سے نکلنے والا نہیں۔ اس طرح منکروں کی نظر میں ان کے اعمال خوش نما بنا دیئے گئے ہیں۔ (الانعام ۱۲۲)

اس آیت میں مومن اور غیر مومن کا فرق زندہ انسان اور مردہ انسان کی مثال کے ذریعہ بتایا گیا ہے۔ جس آدمی کو حق نہ ملا ہو اس کا حال یہ ہوتا ہے کہ وہ غیر حقیقی افکار اور تعصبات میں گھرا ہوتا ہے۔ حق بات سامنے آئے تو وہ حق پر غور کرنے کے بجائے اس کو پیش کرنے والے کی شخصیت کو دیکھے گا اور جب وہ اس کو غیر اہم نظر آئے گی تو وہ اس کی بات کو نظر انداز کر دے گا۔

اس طرح اس کے ذہن پر اپنے مادی مفادات کا غلبہ ہو گا جب اس کو دکھائی دے گا کہ حق کا ساتھ دینے میں اس کے مفادات مجروح ہو رہے ہیں تو وہ مفادات کو بڑی چیز سمجھ کر لے لے گا اور حق کو چھوٹی چیز سمجھ کر اسے چھوڑ دے گا۔ ایک خاص گروہ سے لمبی مدت تک وابستہ رہنے کی بنا پر وہ متعصّبانہ حد تک اس سے جڑ جائے گا۔ اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ جب کسی اور گروہ سے اس کا تعارف ہو گا تو خواہ وہ کتنا ہی برحق ہو مگر اپنے گروہ کے مقابلے میں دوسرے گروہ کی صداقت اس کو نظر نہ آئے گی۔

یہ تقریباً وہی حالت ہے جس کو مقید سوچ (conditioned thinking) کہا جاتا ہے۔

آدمی لمبی وابستگی کے بعد ایک خاص روش سے اتنا زیادہ مانوس ہو جاتا ہے کہ وہ بس اسی میں جینے لگتا ہے۔ اس کے باہر کسی چیز کی اہمیت اسے نظر نہیں آتی۔ یہی وہ شخص ہے جس کو قرآن میں مردہ انسان کہا گیا ہے۔ ایسا انسان حیاتیاتی اعتبار سے زندہ مگر وہ شعور کے اعتبار سے مردہ ہوتا ہے۔

اس کے مقابلے میں دوسرا انسان وہ ہے جس کی فطرت ابھی زندہ تھی اس کے سامنے حق آیا تو اس نے کھلے ذہن سے اس پر غور کیا۔ یہاں تک کہ حق اس کے قلب اور روح میں اتر گیا۔ حق کو پانے کے بعد اس کا حال ایسا ہوا جیسے ایک سوکھا درخت پانی ملنے کے بعد ہرا ابھرا ہو جائے۔ حق نے اس کو حیوان کی سطح سے بلند کر کے حقیقی انسان کی سطح پر پہنچا دیا۔

اب اس کا حال یہ ہو گیا کہ اس کی پوری زندگی حق کی روشنی میں گزرنے لگی۔ ایک طرف اس کا ذہن صحیح سمت میں ارتقاء کرنے لگا۔ صبح و شام کے روحانی تجربات اس کی شخصیت کی مثبت تعمیر کرنے لگے۔ اس کی زندگی بااصول انسان کی زندگی بن گئی۔ دوسری طرف وہ اپنے ماحول میں ایک روشنی کی مانند بن گیا۔ وہ لوگوں کو حق کا راستہ دکھانے لگا۔ اس کو ایک ایسا ربانی مشن مل گیا جس کے لئے وہ اپنی ساری عمر کام کرتا رہے۔

اس تقسیم میں پہلا انسان گویا ایک مردہ انسان ہے، اور دوسرا انسان حقیقی معنوں میں ایک زندہ انسان۔ جو آدمی حیوانیت کی سطح پر جیئے وہ آدمیت کی حیثیت سے ایک مردہ انسان بن گیا۔ اور جو آدمی حیوانیت سے بلند ہو کر انسانیت کی سطح پر جی رہا ہو، وہی اس قابل ہے کہ اس کو حقیقی معنوں میں زندہ انسان کہا جائے۔

6-025

ہدایت اور ضلالت

ہدایت اور گمراہی کا اصول قرآن میں اس طرح بیان کیا گیا ہے: اللہ جس کو چاہتا ہے کہ ہدایت دے تو اس کا سینہ اسلام کے لئے کھول دیتا ہے۔ اور جس کو چاہتا ہے کہ گمراہ کرے تو اس کے سینہ کو بالکل تنگ کر دیتا ہے، جیسے کہ اس کو آسمان پر چڑھنا پڑ رہا ہو۔ اس طرح اللہ گندگی ڈال

دیتا ہے ان لوگوں پر جو ایمان نہیں لاتے۔ (الانعام ۱۲۵)

اس آیت میں بظاہر ہدایت اور ضلالت کو خدا کی طرف منسوب کیا گیا ہے مگر حقیقۃً اس کی نسبت انسانی فطرت کی طرف ہے جو ہر ایک کو خدا کی طرف سے ملی ہوئی ہے۔ جو آدمی اپنی فطرت کو اس کی اصل حالت پر باقی رکھے اس کے لئے اس کی فطرت ایک خدائی رہنما بن جائے گی۔ اس کے برعکس جو آدمی اپنی فطرت کو بگاڑ دے یا اس کو کند کر ڈالے وہ فطرت کی رہنمائی سے محروم ہو کر گمراہیوں میں بھٹکتا رہے گا۔

حق اپنی ذات میں اتنا واضح ہے کہ اس کا سمجھنا کبھی کسی آدمی کے لئے مشکل نہیں ہو سکتا۔ پھر بھی ہر زمانہ میں بے شمار لوگ حق کی وضاحت کے باوجود حق کو قبول نہیں کرتے۔ اس کی وجہ ان کے اندر کی وہ رکاوٹیں ہیں جو وہ اپنی نفسیات میں پیدا کر لیتے ہیں۔ کوئی اپنے آپ کو مقدس ہستیوں سے اتنا زیادہ وابستہ کر لیتا ہے کہ ان کو چھوڑتے ہوئے اس کو محسوس ہوتا ہے کہ وہ بالکل برباد ہو جائے گا۔ کسی کا حال یہ ہوتا ہے کہ اپنی مصلحتوں کا نظام ٹوٹنے کا اندیشہ اس کے اوپر اتنا زیادہ چھا جاتا ہے کہ اس کے لئے حق کی طرف اقدام کرنا ممکن نہیں رہتا۔ کسی کو نظر آتا ہے کہ حق کو ماننا اپنی بڑائی کے مینار کو اپنے ہاتھ سے ڈھا دینا ہے۔ کسی کو محسوس ہوتا ہے کہ ماحول کے رواج کے خلاف ایک بات کو اگر میں نے مان لیا تو میں سارے ماحول میں اجنبی بن کر رہ جاؤں گا۔ اس طرح کے خیالات آدمی کے اوپر اتنا مسلط ہو جاتے ہیں کہ حق کو ماننا اس کو ایک بے حد مشکل بلندی پر چڑھائی کے ہم معنی نظر آنے لگتا ہے جس کو دیکھ کر ہی آدمی کا دل تنگ ہونے لگتا ہے۔

اس کے برعکس معاملہ ان لوگوں کا ہے جو نفسیاتی پیچیدگیوں میں مبتلا نہیں ہوتے، جو حق کو ہر دوسری چیز سے اعلیٰ سمجھتے ہیں۔ وہ پہلے سے سچے متلاشی بنے ہوئے ہوتے ہیں۔ اس لئے جب حق ان کے سامنے آتا ہے تو بلا تاخیر وہ اس کو پہچان لیتے ہیں۔ تمام عذرات اور اندیشوں کو نظر انداز کر کے وہ اس کو قبول کر لیتے ہیں۔

خدا اپنے حق کو نشانیوں (اشاراتی حقائق) کی صورت میں لوگوں کے سامنے لاتا ہے۔اب جو لوگ اپنے دلوں میں کمزوریاں لئے ہوئے ہیں وہ ان اشارات کی خود ساختہ تاویل کر کے اپنے لئے اس کو نہ ماننے کا جواز بنا لیتے ہیں۔اور جن لوگوں کے سینے کھلے ہوتے ہیں وہ اشارات کو ان کی اصل گہرائیوں کے ساتھ پا لیتے ہیں۔اور ان کو اپنے ذہن کی غذا بنا لیتے ہیں۔ان کی زندگی فی الفور اس سیدھے راستہ پر چل پڑتی ہے جو خدا کی براہِ راست رہنمائی میں طے ہوتا ہے اور بالآخر آدمی کو ابدی کامیابی کے مقام پر پہنچا دیتا ہے۔

6-026

حجت بالغہ

قرآن میں ارشاد ہوا ہے: جنھوں نے شرک کیا وہ کہیں گے کہ اگر اللہ چاہتا تو ہم شرک نہ کرتے اور نہ ہمارے باپ دادا کرتے اور نہ ہم کسی چیز کو حرام کر لیتے۔اس طرح جھٹلایا ان لوگوں نے بھی جو ان سے قبل ہوئے ہیں۔یہاں تک کہ انھوں نے ہمارا عذاب چکھا۔کہو کیا تمہارے پاس کوئی علم ہے جس کو تم ہمارے سامنے پیش کرو۔تم تو صرف گمان کی پیروی کر رہے ہو اور محض اٹکل سے کام لیتے ہو۔کہو کہ حجت بالغہ (دلیل محکم) تو اللہ کی ہے۔اور اگر اللہ چاہتا تو تم سب کو ہدایت دے دیتا۔(الانعام ۱۴۸۔۱۴۹)

موجودہ دنیا کو اس کے خالق نے اس طرح بنایا ہے کہ یہاں حقیقی دلیل صرف توحید کے لئے ہو،شرک والحاد کے لئے اس دنیا میں ظن وقیاس کے سوا کوئی اور چیز نہ پائی جائے۔انسان کی پوری فکری تاریخ قرآن کے اس بیان کی تصدیق کرتی ہے۔

مثلاً کچھ لوگوں نے شرک کا عقیدہ گھڑا اور اس کے ثبوت میں یہ کہا کہ دنیا کے مظاہر میں جب تعدد ہے تو اس دنیا کا خدا بھی کئی ہونا چاہئے۔لیکن جب انسانی علم بڑھا اور دنیا کے بارے میں زیادہ واقفیت حاصل ہوئی تو معلوم ہوا کہ یہ تعدد محض ظاہری ہے۔دنیا کی تمام مختلف چیزیں آخر کار ایک ہی مادی اکائی (ایٹم) سے تشکیل پا کر بنیں۔حتی کہ پوری وسیع کائنات ایک ہی فطری قانون

کے تحت چل رہی ہے۔اس طرح مشرکانہ فکر آخر کار ایک فرضی قیاس ثابت ہوا،اور موحدانہ فکر کے بارے میں علمی طور پر ثابت ہوا کہ وہ محکم دلیل کی بنیاد پر قائم ہے۔

اسی طرح خدا کے وجود پر شک ظاہر کرتے ہوئے کچھ لوگوں نے کہا کہ اگر خدا نے کائنات کو پیدا کیا ہے تو خدا کو کس نے پیدا کیا۔ لیکن جب علم کا دریا آگے بڑھا تو معلوم ہوا کہ یہ سوال ایک بے بنیاد سوال ہے۔ جدید علم بتاتا ہے کہ اس دنیا میں ہمارے لئے جو انتخاب(choice) ہے وہ بے خدا کائنات (Universe without God) اور باخدا کائنات(Universe with God) میں نہیں ہے بلکہ ہمارے لئے اصل انتخاب باخدا کائنات (Univese with God) یا غیر موجود کائنات(no universe at all) کے درمیان ہے۔اب چونکہ ہمارے لئے غیر موجود کائنات کا انتخاب ممکن نہیں،اس لئے واحد ممکن صورت یہ ہے کہ ہم خدا کے وجود کا اقرار کریں۔

6-027

حرام وحلال

قران میں ارشاد ہوا ہے: کہو، آؤ میں سناؤں وہ چیزیں جو تمہارے رب نے تم پر حرام کی ہیں۔ یہ کہ تم اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کرو اور ماں باپ کے ساتھ نیک سلوک کرو اور اپنی اولاد کو مفلسی کے ڈر سے قتل نہ کرو۔ ہم تم کو بھی رزق دیتے ہیں اور ان کو بھی۔ اور بے حیائی کے کام کے پاس نہ جاؤ خواہ وہ ظاہر ہو یا پوشیدہ۔ اور جس جان کو اللہ نے حرام ٹھہر لیا اس کو نہ مارو مگر حق پر۔ یہ باتیں ہیں جن کی خدا نے تمہیں ہدایت فرمائی ہے تاکہ تم عقل سے کام لو۔ اور یتیم کے مال کے پاس نہ جاؤ مگر ایسے طریقہ سے جو بہتر ہو۔ یہاں تک کہ وہ اپنی جوانی کو پہنچ جائے۔ اور ناپ تول میں پورا انصاف کرو۔ ہم کسی کے ذمہ وہی چیز لازم کرتے ہیں جس کی اسے طاقت ہو۔ اور جب بولو تو انصاف کی بات بولو خواہ معاملہ اپنے رشتہ دار کا ہی ہو۔ اور اللہ کے عہد کو پورا کرو۔ یہ چیزیں ہیں جس کا اللہ نے تمہیں حکم دیا ہے تاکہ تم نصیحت پکڑو۔ اور اللہ نے حکم دیا کہ یہی میری سیدھی شاہراہ ہے۔ پس اسی پر چلو اور دوسرے راستوں پر نہ چلو کہ وہ تم کو اللہ کے راستہ سے جدا

کر دیں گے۔ یہ اللہ نے تم کو حکم دیا ہے تاکہ تم بچتے رہو۔ (الانعام ۱۵۱۔۱۵۳)

یہ باتیں جو ان آیتوں میں بیان کی گئی ہیں وہ قرآن کے مطابق، خدا کے صراطِ مستقیم کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اہل دین کو چاہئے کہ وہ انھیں باتوں پر سب سے زیادہ زور دیں۔ اس کے علاوہ دوسری باتوں پر زور دینا گویا شاہراہ سے ہٹ کر اطراف کے چھوٹے راستوں میں بھٹکنا ہے۔ اور جو لوگ اِدھر اُدھر کے راستوں میں بھٹک جائیں وہ منزل مقصود تک نہیں پہنچ سکتے۔

6-028

فرق برائے امتحان

قرآن میں ارشاد ہوا ہے: اور وہی ہے جس نے تمہیں زمین میں ایک دوسرے کا جانشین بنایا اور تم میں سے ایک کا رتبہ دوسرے پر بلند کیا۔ تاکہ وہ آزمائے تم کو اپنے دئے ہوئے میں۔ تمہارا رب جلد سزا دینے والا ہے اور وہ بخشنے والا مہربان ہے۔ (الانعام ۱۶۵)

دنیا میں ایک انسان اور دوسرے انسان کے درمیان برابری نہیں، سیاسی اعتبار سے بھی اور غیر سیاسی اعتبار سے بھی۔ یہ نابرابری خدا کے تخلیقی نقشہ کی بنا پر ہے، وہ کوئی خرابی یا برائی نہیں ہے۔ نابرابری کا یہ نظام نہ ہو تو لوگوں کی آزمائش نہیں کی جاسکتی۔ اسی نابرابری کی وجہ سے وہ تمام حالات پیدا ہوتے ہیں جو لوگوں کے لئے آزمائش کا پرچہ بن سکیں۔

دنیا کا نظام یہ ہے کہ یہاں ایک شخص جاتا ہے اور دوسرا اس کی جگہ آتا ہے۔ ایک قوم پیچھے ہٹادی جاتی ہے اور دوسری قوم اس کے بجائے زمین کے ذرائع و وسائل پر قبضہ کر لیتی ہے۔ یہ واقعہ بار بار یاد دلاتا ہے کہ یہاں کسی کا اقتدار دائمی نہیں۔ مگر انسان کا حال یہ ہے کہ جب کسی کو زمین پر موقع ملتا ہے تو وہ گزرے ہوئے لوگوں کے انجام کو بھول جاتا ہے۔ وہ اپنے ظلم اور سرکشی کو جائز ثابت کرنے کے لئے طرح طرح کے دلائل گھڑ لیتا ہے۔ مگر جب خدا حقیقتوں کو برہنہ کرے گا تو آدمی دیکھے گا کہ اس کی ان باتوں کی کوئی قیمت نہ تھی جن کو وہ اپنے موقف کے جواز کے لئے مضبوط دلیل سمجھے ہوئے تھا۔

دنیا میں آدمی کی سرکشی کی وجہ اکثر یہ ہوتی ہے کہ وہ دنیا کی چیزوں کو اپنے حق میں خدا کا انعام سمجھ لیتا ہے۔ حالانکہ دنیا میں جو کچھ کسی کو ملتا ہے وہ صرف بطور آزمائش ہے نہ کہ بطور انعام۔ دنیا کی چیزوں کو آدمی اگر انعام سمجھے تو اس کے اندر فخر پیدا ہو گا اور اگر وہ ان کو آزمائش سمجھے تو اس کے اندر عجز پیدا ہو گا۔ فخر کی نفسیات سرکشی پیدا کرتی ہے اور عجز کی نفسیات اطاعت۔

7-029

شیطان کی پیروی

قرآن میں انسان کی تخلیق کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد ہوا ہے: اور ہم نے تم کو پیدا کیا، پھر ہم نے تمہاری صورت بنائی۔ پھر فرشتوں سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو۔ پس انھوں نے سجدہ کیا۔ مگر ابلیس سجدہ کرنے والوں میں شامل نہ ہوا۔ خدا نے کہا کہ تجھے کس چیز نے سجدہ کرنے سے روکا جب کہ میں نے تجھ کو حکم دیا تھا۔ ابلیس نے کہا کہ میں اس سے بہتر ہوں۔ تو نے مجھ کو آگ سے بنایا ہے اور آدم کو مٹی سے۔ خدا نے کہا کہ تو اتر یہاں سے۔ تجھے یہ حق نہیں کہ تو اس میں گھمنڈ کرے۔ پس نکل جا، یقیناً تو ذلیل ہے۔ ابلیس نے کہا کہ اس دن تک کے لئے تو مجھے مہلت دے جب کہ سب لوگ اٹھائے جائیں گے۔ خدا نے کہا کہ تجھ کو مہلت دی گئی۔ ابلیس نے کہا کہ چونکہ تو نے مجھے گمراہ کیا ہے، میں بھی لوگوں کے لئے تیری سیدھی راہ پر بیٹھوں گا۔ پھر ان پر آؤں گا ان کے آگے سے ان کے پیچھے سے اور ان کے دائیں سے اور ان کے بائیں سے، اور تو ان میں سے اکثر کو شکر گزار نہ پائے گا۔ خدا نے کہا کہ نکل یہاں سے ذلیل اور ٹھکرایا ہوا۔ جو کوئی ان میں سے تیری راہ پر چلے گا تو میں تم سب سے جہنم کو بھر دوں گا۔ (الاعراف ۱۱۔۱۸)

خدا نے انسان کو اس دنیا میں جو کچھ دیا ہے اس لئے دیا ہے کہ اس کا نفسیاتی جواب وہ شکر کی صورت میں پیش کرے۔ مگر یہی وہ چیز ہے جس کو آدمی اپنے رب کے سامنے پیش نہیں کرتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شیطان اس کے اندر دوسرے دوسرے جذبات ابھار کر اس کو شکر کی نفسیات سے دور کر دیتا ہے۔

آدم اور ابلیس کے قصہ سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں ہدایت اور گمراہی کا معرکہ کہاں برپا ہوتا ہے۔ یہ معرکہ ان مواقع پر برپا ہے جہاں آدمی کے اندر حسد اور گھمنڈ کی نفسیات جاگتی ہیں۔ امتحان کی اس دنیا میں بار بار ایسا ہوتا ہے کہ ایک آدمی دوسرے آدمی سے اوپر اٹھ جاتا ہے۔ کبھی کوئی شخص دولت و عزت میں دوسرے سے زیادہ حصہ پالیتا ہے۔ کبھی دو آدمیوں کے درمیان ایسا معاملہ پڑتا ہے کہ ایک شخص کے لئے دوسرے کو اس کا جائز حق دینا اپنے کو نیچے گرانے کے ہم معنیٰ نظر آتا ہے۔ کبھی کسی شخص کی زبان سے خدا ایک سچائی کا اعلان کراتا ہے اور لوگوں کو محسوس ہوتا ہے کہ اس کا اعتراف کرنا اس کے مقابلہ میں اپنے کو چھوٹا کرنے کے ہم معنیٰ ہے۔ ایسے مواقع پر شیطان آدمی کے اندر حسد اور گھمنڈ کی نفسیات جگا دیتا ہے۔ ''میں بہتر ہوں'' کے احساس کی بنا پر وہ دوسرے کے فضل کو ماننے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ یہی خدا کی نظر میں شیطان کے راستہ پر چلنا ہے۔ جس شخص نے ایسے مواقع پر حسد اور گھمنڈ اور بے اعترافی کا طریقہ اختیار کیا۔ اس نے اپنے کو جہنمی انجام کا مستحق بنالیا جو شیطان کے لئے مقدر ہے اور جس نے ایسے مواقع پر شیطان کے پیدا کئے ہوئے جذبات کو اپنے اندر کچل ڈالا اس نے اس بات کا ثبوت دیا کہ وہ اس قابل ہے کہ اس کو جنت کے باغوں میں بسایا جائے۔

اس دنیا میں جو کچھ کسی کو ملتا ہے وہ خدا کی طرف سے ملتا ہے۔ اس لئے کسی کی فضیلت کا اعتراف دراصل خدا کی تقسیم کے برحق ہونے کا اعتراف ہے اور اس کی فضیلت کو نہ ماننا خدا کی تقسیم کو نہ ماننا ہے۔ اس طرح جب ایک شخص کسی حق کی بنا پر دوسرے کے آگے جھکتا ہے تو وہ کسی آدمی کے آگے نہیں جھکتا بلکہ خدا کے آگے جھکتا ہے۔ کیوں کہ ایسا وہ خدا کے حکم کی بنا پر کر رہا ہے نہ کہ اس آدمی کے ذاتی فضل کی بنا پر۔ شکر تمام نیکیوں کی جڑ ہے اور کبر تمام برائیوں کی جڑ۔ یہی وجہ ہے کہ شکر سب سے بڑی عبادت ہے اور کبر سب سے بڑا گناہ۔

7-030

پیغمبر صالح کی مثال

حضرت صالح ایک پیغمبر تھے جو قوم ثمود کی طرف بھیجے گئے۔ قوم ثمود نے حضرت صالح

کے ساتھ سرکشی کی۔ اس سلسلے میں قرآن میں ارشاد ہوا ہے: پھر انھوں نے اونٹنی کو کاٹ ڈالا اور اپنے رب کے حکم سے پھر گئے۔ اور انھوں نے کہا، اے صالح اگر تم پیغمبر ہو تو وہ عذاب ہم پر لے آؤ جس سے تم ہم کو ڈراتے تھے۔ پھر انھیں زلزلہ نے آپکڑا اور وہ اپنے گھر میں اوندھے منہ پڑے رہ گئے۔ اور صالح یہ کہتے ہوئے ان کی بستی سے نکل گئے کہ اے میری قوم، میں نے تم کو اپنے رب کا پیغام پہنچا دیا اور میں نے تمہاری خیر خواہی کی مگر تم خیر خواہوں کو پسند نہیں کرتے (الاعراف ۷۸۔۷۹)

حضرت صالح کی اونٹنی کو مارنے والا اگرچہ قوم کا صرف ایک سرکش آدمی تھا۔ مگر یہاں اس کو پوری قوم کی طرف منسوب کرتے ہوئے فرمایا "ان لوگوں نے اونٹنی کو ہلاک کر دیا" اس سے معلوم ہوا کہ کسی گروہ کا ایک شخص برا عمل کرے اور دوسرے لوگ اس کے برے فعل پر راضی رہیں تو سب کے سب اس مجرمانہ فعل میں شریک قرار دئے جاتے ہیں۔

جو قوم خواہش پرستی کا شکار ہو اس کو حقیقت پسندی کی باتیں اپیل نہیں کرتیں۔ وہ ایسے شخص کا ساتھ دینے کے لئے تیار نہیں ہوتی جو اس کو سنجیدہ عمل کی طرف بلاتا ہو۔ اس کے برعکس جو لوگ خوش نما الفاظ بولیں اور جھوٹی امیدوں کی تجارت کریں ان کے گرد بھیڑ کی بھیڑ جمع ہو جاتی ہے۔ سچے خیر خواہ کے لئے اس کے اندر کوئی کشش نہیں ہوتی۔ البتہ ان لوگوں کی طرف وہ تیزی سے دوڑ پڑتی ہے جو اس کا استحصال کرنے کے لئے اٹھے ہوں ـــــ یہی مطلب ہے حضرت صالح کے اس قول کا کہ میں نے تمہارے ساتھ خیر خواہی کی مگر تم خیر خواہوں کو پسند نہیں کرتے۔

7-031

غفلت، گمراہی کا سبب

قرآن میں ارشاد ہوا ہے: اور ہم نے جنات اور انسان میں سے بہتوں کو دوزخ کے لئے پیدا کیا ہے۔ ان کے دل ہیں جن سے وہ سمجھتے نہیں، ان کے آنکھیں ہیں جن سے وہ دیکھتے نہیں،

ان کے کان ہیں جن سے وہ سنتے نہیں۔ وہ ایسے ہیں جیسے چوپائے بلکہ ان سے بھی زیادہ بے راہ۔ یہی لوگ ہیں غافل۔ (الاعراف۔۱۷۹)

اس آیت میں ہدایت اور گمراہی کا فطری قانون بتایا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کو آنکھ اور کان دئے ہیں جن کے ذریعہ وہ معلومات حاصل کرے۔ اسی کے ساتھ اللہ نے ہر انسان کو ذہن دیا جس کے ذریعہ وہ باتوں کو سمجھے اور حق اور باطل کے درمیان تمیز کرے۔ لیکن جو لوگ غفلت میں پڑ جائیں ان کو کوئی چیز ہدایت دینے والی نہیں۔

سچائی ایک ایسی چیز ہے جسے ہر آدمی کو خود پانا ہے۔ خدا نے ہر آدمی کو دل اور آنکھ اور کان دئے ہیں۔ آدمی انہی صلاحیتوں کو استعمال کر کے سچائی کو پاتا ہے۔ اور جو شخص ان صلاحیتوں کو استعمال نہ کرے وہ یقیناً سچائی کو پانے سے محروم رہے گا، خواہ سچائی اس سے کتنا زیادہ قریب موجود ہو۔

سچائی کو پانا ہر آدمی کا ایک شعوری اور ارادی فعل ہے۔ سچائی کو وہی شخص سمجھ سکتا ہے جس نے اپنے دل کے دروازے اس کے لئے کھلے رکھے ہوں۔ اس کو وہی دیکھ سکتا ہے جس نے اپنی آنکھوں پر مصنوعی پردے نہ ڈالے ہوں۔ اس کی آواز اسی کو سنائی دے سکتی ہے جس نے اپنے کان میں کسی قسم کے ڈاٹ نہ لگا رکھے ہوں۔ ایسے لوگ سچائی کی آواز کو پہچان کر اس کے آگے اپنے کو ڈال دیں گے۔ اور جس شخص کا معاملہ اس کے برعکس ہو وہ چوپایوں کی طرح ناسمجھ بنا رہے گا۔ پہاڑ جیسے دلائل کا وزن محسوس کرنا بھی اس کے لئے ممکن نہ ہوگا۔ اس کے سامنے خدا کی تجلیاں ظاہر ہوں گی مگر وہ اس کو دیکھنے سے عاجز ہوگا۔ اس کے پاس خدا کا نغمہ چھیڑا جائے گا مگر وہ اس کو سننے سے محروم رہے گا۔ سچائی ہمیشہ بیدار لوگوں کو ملتی ہے۔ غافلوں کے لئے کوئی سچائی نہیں۔

7-032

شیطان کی وسوسہ اندازی

قرآن میں ارشاد ہوا ہے: درگزر کرو۔ نیکی کا حکم دو اور جاہلوں سے نہ الجھو۔ اور اگر تم کو

کوئی وسوسہ شیطان کی طرف سے آئے تو اللہ کی پناہ چاہو۔ بے شک وہ سننے والا جاننے والا ہے۔(الاعراف۱۹۹۔۲۰۰)

اس آیت میں داعی کا کردار بتایا گیا ہے۔ داعی پر لازم ہے کہ وہ مدعو کے مقابلے میں ہمیشہ اعراض اور عفو و درگزر کا طریقہ اختیار کرے۔ اس کے بغیر دعوت کا کام معتدل انداز میں انجام نہیں پا سکتا۔ اگر کبھی ایسا ہو کہ مدعو کی طرف سے کسی ناخوش گوار رویہ پر داعی کے اندر انتقامی جذبہ بھڑک اٹھے تو ایسے جذبہ کو سراسر شیطانی وسوسہ سمجھنا چاہئے اور اللہ سے توفیق مانگنا چاہئے کہ اس کے سینہ کو اس قسم کے منفی جذبہ سے پاک کردے۔

7-033

حساسیت ڈھال ہے

قرآن میں ارشاد ہوا ہے: جو لوگ ڈر رکھتے ہیں جب کبھی شیطان کے اثر سے کوئی برا خیال انھیں چھو جاتا ہے تو وہ فوراً چونک پڑتے ہیں اور پھر اسی وقت ان کو سوجھ آجاتی ہے۔ اور جو لوگ شیطان کے بھائی ہیں وہ ان کی گمراہی میں کھنچے چلے جاتے ہیں پھر وہ کمی نہیں کرتے۔ (الاعراف۲۰۱۔۲۰۲)

متقیانہ حساسیت اس دنیا میں سب سے بڑا چیک ہے۔ آدمی کے اندر اگر یہ حساسیت ہو تو وہ برائیوں سے محفوظ رہے گا اور اگر یہ حساسیت نہ ہو تو کوئی بھی دوسری چیز اس کو برائیوں سے بچانے والی نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ موجودہ دنیا میں ہر شخص نفس اور شیطان کے حملوں کی زد میں ہے۔ ایسی حالت میں جو چیز آدمی کو بچانے والی ہے وہ صرف اللہ کا ڈر ہے۔ اللہ کا ڈر آدمی کو بے حد حساس بنا دیتا ہے۔ یہی حساسیت موجودہ امتحان کی دنیا میں آدمی کی سب سے بڑی ڈھال ہے۔ جب بھی آدمی کے اندر کوئی غلط خیال آتا ہے یا کسی قسم کی منفی نفسیات ابھرتی ہے تو اس کی حساسیت فوراً اس کو بتادیتی ہے کہ وہ پھسل گیا ہے۔ ایک لمحہ کی غفلت کے بعد اس کی آنکھ کھل جاتی ہے اور وہ

اللہ سے معافی مانگتے ہوئے دوبارہ اپنے کو درست کر لیتا ہے۔ اس کے برعکس جو لوگ اللہ کے ڈر سے خالی ہوتے ہیں ان کے اندر شیطان داخل ہو کر اپنا کام کرتا رہتا ہے۔ ان کو محسوس بھی نہیں ہوتا کہ وہ شیطان کے ساتھی بن کر کسی تباہ کن گڑھے کی طرف چلے جارہے ہیں۔ حساسیت آدمی کی سب سے بڑی محافظ ہے جب کہ بے حسی آدمی کو شیطان کے مقابلہ میں آخری حد تک غیر محفوظ بنادیتی ہے۔

8-034

مومن کی صفات

قرآن میں ارشاد ہوا ہے: ایمان والے لوگ وہ ہیں کہ جب اللہ کا ذکر کیا جائے تو ان کے دل دہل اٹھیں اور جب اللہ کی آیتیں ان کے سامنے پڑھی جائیں تو وہ ان کا ایمان بڑھادیتی ہیں اور وہ اپنے رب پر بھروسہ رکھتے ہیں۔ وہ نماز قائم کرتے ہیں اور جو کچھ ہم نے انھیں دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔ یہی لوگ حقیقی مومن ہیں۔ ان کے لئے ان کے رب کے پاس درجے اور مغفرت ہیں اور ان کے لئے عزت کی روزی ہے۔ (الانفال ۲۔۴)

ایمان عظیم ترین حقیقت کی دریافت ہے۔ جب یہ حقیقت کسی آدمی کے سینے میں اترتی ہے تو وہ اس کی پوری شخصیت میں زلزلہ پیدا کر دیتی ہے۔ ایسے انسان کا حال یہ ہوتا ہے کہ جب اس کو کسی حق کی یاد دلائی جائے تو وہ فوراً ہی اسے قبول کر لیتا ہے۔ خدا کو قادر مطلق کے طور پر دریافت کرنا اس کے اندر فطری طور پر اعتماد کی صفت پیدا کر دیتا ہے۔

ایسے انسان کے اندر فطری طور پر ہر قسم کی اعلیٰ صفات پیدا ہونے لگتی ہیں۔ وہ ایک طرف اللہ کا سچا عبادت گزار بن جاتا ہے اور دوسری طرف بندوں کا سچا دوست اور خیر خواہ۔

خدا کو اس کی عظمت و کمال کے ساتھ دریافت کرنا کوئی سادہ بات نہیں۔ یہ ایک ایسی دریافت ہے جو آدمی کے اندر سے فخر اور برتری کے تمام احساسات کو مٹادیتی ہے۔ وہ اس کو حقیقی معنوں میں ایک مومن بنادیتی ہے، اور حقیقی مومن ہی کا دوسرا نام حقیقی انسان ہے۔

8-035

حق وباطل میں امتیاز

قرآن میں ارشاد ہوا ہے: اے ایمان والو، اگر تم اللہ سے ڈرو تو وہ تمہارے لئے فرقان بہم پہنچائے گا۔ اور تم سے تمہارے گناہوں کو دور کر دے گا اور تم کو بخش دے گا اور اللہ بڑے فضل والا ہے۔ (الانفال ۲۹)

متقی انسان وہ ہے جس کے سینہ میں اندیشہ ناک دل ہو جو ایک طرف خدا کی رحمت کا امیدوار ہو اور اسی کے ساتھ اللہ کی پکڑ سے بہت زیادہ ڈرنے لگے۔ ایسا انسان صحیح اور غلط کے معاملے میں بہت زیادہ حساس ہو جاتا ہے۔ وہ اس کا تحمل نہیں کر سکتا کہ ایک چیز کو حق جانے اور اس کے باوجود وہ اس کو اختیار نہ کرے۔ اسی طرح وہ اس کا تحمل نہیں کر سکتا کہ وہ ایک چیز کو باطل جانے اور اس کے باوجود وہ اس میں ملوث ہو جائے۔

اس قسم کی اندیشہ ناک نفسیات آدمی کے اندر وہ صلاحیت پیدا کر دیتی ہے جس کو یہاں فرقان کہا گیا ہے۔ یعنی حق اور باطل کے درمیان تمیز کرنے والا۔ جس آدمی کے اندر یہ صلاحیت پیدا ہو جائے وہ اس کے لئے اس بات کی ضامن بن جائے گی کہ وہ ہمیشہ صحیح انداز میں سوچے، اور اپنی عملی روش کے لئے ہمیشہ صحیح رویہ اختیار کرے۔

8-036

صلح کی حکمت

قرآن میں دشمن طاقتوں کا ذکر کرتے ہوئے پیغمبر اسلام سے کہا گیا ہے: اور اگر وہ صلح کی طرف جھکیں تو تم بھی اس کے لئے جھک جاؤ اور اللہ پر بھروسہ رکھو۔ بے شک وہ سننے والا جاننے والا ہے۔ اور اگر وہ تم کو دھوکا دینا چاہیں گے تو اللہ تمہارے لئے کافی ہے۔ وہی ہے جس نے اپنی نصرت اور مومنین کے ذریعہ تم کو قوت دی۔ (الانفال ۶۱ ۔ ۶۲)

اس سے معلوم ہوا کہ فریق مخالف اگر یہ پیش کش کرے کہ آؤ، ہم مقابلہ آرائی کا طریقہ

چھوڑ کر آپس میں صلح کرلیں تو اہل ایمان کو چاہئے کہ وہ اس پیش کش کو قبول کرلیں۔ اگر بالفرض یہ اندیشہ ہو کہ فریق مخالف کا دل صاف نہیں ہے اور وہ دھوکہ دینے کے ارادے سے ایسا کر رہا ہے تب بھی اہل ایمان کو چاہئے کہ اللہ کے بھروسے پر اس کی پیش کش کو قبول کرلیں۔

اس قرآنی اصول میں ایک اہم حکمت چھپی ہوئی ہے۔ وہ یہ کہ صلح اہل ایمان کو عمل کے میدان سے ہٹاتی نہیں، بلکہ وہ ان کو دوسرے، زیادہ بڑے عمل کی طرف موڑ دیتی ہے۔ اور یہ تعمیر واستحکام کا عمل ہے۔ جنگ و مقابلہ کی حالت میں تعمیری سرگرمیاں رکی رہتی ہیں جب کہ صلح تعمیر کے مواقع کو کھول دینے والی ہے۔ اگر صلح کے ذریعہ حاصل ہونے والے مواقع کو تعمیر و استحکام کے لئے استعمال کیا جائے تو عین ممکن ہے کہ اس سے اتنا بڑا مثبت فائدہ حاصل ہو جائے جو جنگ وقتال کے ذریعہ ہرگز ممکن نہیں۔

9-037

دعوت و تبلیغ ہر حال میں

قرآن میں ارشاد ہوا ہے: اور اگر مشرکین میں سے کوئی شخص تم سے پناہ مانگے تو اس کو پناہ دے دو تاکہ وہ اللہ کا کلام سنے پھر اس کو اس کی امان کی جگہ پہنچا دو۔ یہ اس لئے کہ وہ لوگ علم نہیں رکھتے۔ (التوبہ ۶)

قرآن کی یہ آیت دور اول کے ان مخالفین اسلام کے بارے میں ہے جو اس زمانے کے مسلمانوں سے برسر جنگ تھے۔ اس کے باوجود انھیں حسبِ حالات اسلام سے متعارف کرانے کا حکم دیا گیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ نہ صرف عام حالت میں بلکہ ہنگامی حالت میں بھی دعوت و تبلیغ کے عمل کو جاری رہنا چاہئے۔

جنگ کے زمانہ میں اگر دشمن کا کوئی فرد یہ کہے کہ میں اسلام کو سمجھنا چاہتا ہوں تو مسلمانوں کو حکم ہے کہ اس کو امان دے کر اپنے ماحول میں آنے کا موقع دیں اور اسلام کے پیغام سے اس کو متعارف کرنے کی کوشش کریں۔ اس کے باوجود اگر وہ اسلام کی طرف راغب نہ ہو تو

اپنی حفاظت میں اس کو اس کے ٹھکانے تک پہنچادیں۔ بظاہر اگرچہ وہ دشمن گروہ کا ایک فرد ہے مگر یہ درست نہ ہوگا کہ اس کو دشمن سمجھ کر اس کے ساتھ سخت معاملہ کیا جائے۔

جنگ کے زمانہ میں دشمن کو اس کی رعایت دینا انتہائی نازک ہے۔ کیوں کہ عین ممکن ہے کہ دشمن کا کوئی جاسوس اس رعایت سے فائدہ اٹھا کر مسلمانوں کے اندر گھس آئے اور ان کے فوجی راز معلوم کرنے کی کوشش کرے۔ مگر اسلام کی نظر میں دعوت و تبلیغ کا مسئلہ اتنا زیادہ اہم ہے کہ اس نازک خطرہ کے باوجود اس کا دروازہ بند نہیں کیا گیا۔

9-038

جارحیت نہیں

اجتماعی معاہدات کا ذکر کرتے ہوئے قرآن میں ارشاد ہوا ہے: ان مشرکوں کے لئے اللہ اور اس کے رسول کے ذمہ کوئی عہد کیسے رہ سکتا ہے، مگر جن لوگوں سے تم نے عہد کیا تھا مسجد حرام کے پاس، پس جب تک وہ تم سے سیدھے رہیں تم بھی ان سے سیدھے رہو، بے شک اللہ پرہیزگاروں کو پسند کرتا ہے۔ (التوبہ ۷)

قرآن کی اس آیت سے بین اقوامی تعلق کا بنیادی اصول معلوم ہوتا ہے۔ وہ اصول یہ ہے کہ جب تک فریق ثانی باہمی تعلق میں مستقیم رہے اہل ایمان کو بھی ان کے ساتھ مستقیم رہنا چاہئے۔ اگر فریق ثانی اس شرط کو توڑ دے تو اس کے بعد اہل ایمان بھی حسب حال اپنے بچاؤ کے لئے ضروری اقدام کر سکتے ہیں۔

مستقیم ہونے کی دو بڑی صورتیں ہیں۔ ایک یہ ہے کہ دونوں فریقوں کے درمیان باقاعدہ طور پر کوئی تحریری معاہدہ ہوا ہو۔ ایسی حالت میں مستقیم ہونے یا نہ ہونے کا معیار معاہدہ کی یہ تحریر ہوگی۔ دوسری صورت یہ ہے کہ کوئی انٹرنیشنل قانون یا رواج موجود ہو جس کو عمومی طور پر قوموں کے درمیان تسلیم کیا جاتا ہو۔ ایسی حالت میں اس بین اقوامی رواج یا قانون کو بھی مسلّمہ معیار کی حیثیت حاصل ہوگی جس کی بنیاد پر یہ طے کیا جائے گا کہ فریقِ ثانی مستقیم ہونے کے

مطلوب معیار پر قائم ہے یا نہیں۔

بین اقوامی تعلقات یا صلح و جنگ کے لئے یہی بنیادی اصول ہے۔ اس اصول کی تعمیل ہر حال میں مطلوب ہے، کسی بھی حال میں اس کی خلاف ورزی کرنا کسی مسلم گروہ کے لئے جائز نہیں۔

9-039

زوال کی علامت

قدیم اہل کتاب کو خطاب کرتے ہوئے قرآن میں ارشاد ہوا ہے: انہوں نے احبار اور اپنے رہبان کو اللہ کے سوا رب بناڈالا اور مسیح ابن مریم کو بھی۔ حالانکہ ان کو صرف یہ حکم تھا کہ وہ ایک معبود کی عبادت کریں۔ وہ پاک ہے اس سے جو وہ شریک کرتے ہیں (التوبہ ۳۱)

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ جب کوئی امت زوال کا شکار ہوتی ہے تو اس کے اندر کیا خاص کمزوری پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ یہ کہ ایسی امت رسمی طور پر تو خدا کو مانتی ہے مگر عملی طور پر اس کا پورا دین احبار و رہبان کی بنیاد پر قائم ہو جاتا ہے۔ خدا کی کتاب اب ان کے یہاں صرف برکت کی چیز بن جاتی ہے۔ وہ اپنا دین علماء کے اقوال اور بزرگوں کے ملفوظات سے لینے لگتے ہیں نہ کہ حقیقۃً خدا اور اس کے رسول کے کلام سے۔

وہ خدا کی عظمت سے بے خبر ہو کر اپنی کچھ شخصیتوں کو اکابر کا درجہ دے دیتے ہیں۔ ان مفروضہ اکابر کے اردگرد پر اسرار کہانیوں کا ایک طلسماتی ہالہ بن جاتا ہے۔ ان بے اصل کہانیوں پر لوگ اس طرح یقین کر لیتے ہیں جیسے کہ وہ بالکل واقعہ ہوں۔ ایسے لوگ بظاہر اپنی زبان سے خدا کا انکار نہیں کرتے مگر عملاً وہ اپنے اکابر کو وہی درجہ دے دیتے ہیں جو صرف خدا کا ہونا چاہئے۔ اسی عملی حالت کی بنا پر اس آیت میں انھیں اللہ کے سوا دوسروں کو اپنا رب بنانے کا مجرم قرار دیا گیا۔

9-040

ایک گروہ ضروری

قرآن میں ارشاد ہوا ہے: اور یہ ممکن نہ تھا کہ اہل ایمان سب کے سب نکل کھڑے

ہوں۔ تو ایسا کیوں نہ ہوا کہ ان کے گروہ میں سے ایک حصہ نکل کر آتا تاکہ وہ دین میں سمجھ پیدا کرتا اور واپس جا کر اپنی قوم کے لوگوں کو آگاہ کرتا تاکہ وہ بھی پرہیز کرنے والے بنتے۔ (التوبہ ۱۲۲)

اسلام میں یہ مطلوب ہے کہ ہر زمانہ کے مسلمانوں میں کم از کم ایک داعی گروہ موجود ہو۔ اس مقصد کے لئے ملت کے اندر ایک باقاعدہ تعلیمی نظام ہونا ضروری ہے، تاکہ نسل در نسل ہر زمانہ میں ایسے دعوتی افراد تیار ہوتے رہیں اور دعوت کے عمل کا تسلسل ہر انسانی نسل میں جاری رہے۔

اس مقصد کے لئے جو تعلیمی نظام بنایا جائے اس کا بنیادی نصاب مذکورہ آیت کے مطابق، دو قسم کے اجزاء پر مشتمل ہونا چاہئے۔ ایک یہ کہ وہ حق کا پورا علم اور اس کے کامل فہم کی استعداد پیدا کرتا ہو۔ دوسرے یہ کہ افراد ان دیگر علوم سے مسلح ہوں جو مدعو قوم کی نسبت سے ضروری ہے۔ مثلاً مدعو کی زبان جاننا اور زمانہ کے افکار سے واقف ہونا، وغیرہ۔

ملت کے اوپر فرض کے درجہ میں ضروری ہے کہ وہ تعلیم و تربیت کا ایسا انتظام کرے جس کے ذریعہ ہر نسل اور ہر دور میں ایسے داعی افراد تیار ہوتے رہیں۔ کوئی بھی دوسری سرگرمی اس ذمہ داری کا بدل نہیں بن سکتی۔ مثال کے طور پر مسلمان کسی زمانہ میں اس قسم کے داعی گروہ تیار نہ کریں تو وہ اللہ کے یہاں صرف اس لئے بری الذمہ نہیں ہوسکتے کہ انہوں نے ہر جگہ عالیشان مسجدیں کھڑی کردی ہیں۔

10-041

فطرت کا الارم

قرآن میں ارشاد ہوا ہے: اور انسان کو جب کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو وہ کھڑے اور بیٹھے اور لیٹے ہم کو پکارتا ہے۔ پھر جب ہم اس سے اس کی تکلیف کو دور کر دیتے ہیں تو وہ ایسا ہو جاتا ہے گویا اس نے کبھی اپنے کسی برے وقت پر ہم کو پکارا ہی نہ تھا۔ اس طرح حد سے گذرنے والوں کے لئے ان کے اعمال خوش نما بنا دئے گئے ہیں۔ (یونس ۱۲)

دنیا کا نظام اس طرح بنا ہے کہ آدمی بار بار کسی نہ کسی تکلیف یا حادثہ کی زد میں آجاتا ہے۔

جب ایسا ہوتا ہے تو آدمی محسوس کرنے لگتا ہے کہ خارجی طاقتوں کے مقابلہ میں وہ بالکل بے بس ہے۔ اس وقت آدمی بے اختیار ہو کر خدا کو پکارنے لگتا ہے۔ وہ خدا کی قدرت کے مقابلہ میں اپنے عجز کا اعتراف کر لیتا ہے۔ مگر یہ حالت صرف اس وقت تک رہتی ہے جب تک وہ مصیبتوں کی گرفت میں ہو، مصیبت سے نجات پاتے ہی وہ دوبارہ ویسا ہی غافل اور سرکش بن جاتا ہے جیسا کہ وہ اس سے پہلے تھا۔ ایسے لوگوں کے اظہار بندگی کو خدا تسلیم نہیں کرتا۔ کیوں کہ اظہار بندگی وہ مطلوب ہے جو آزادانہ حالات میں کی جائے، مجبورانہ حالات میں ظاہر کی ہوئی بندگی کی خدا کے نزدیک کوئی قیمت نہیں۔

حقیقت کی تلاش کا پہلا مرحلہ اپنے عجز کی دریافت ہے۔ آدمی جب اس تجربہ سے گزرتا ہے تو وہ محسوس کرتا ہے کہ خدا کے بغیر اس کا وجود بالکل بے معنی ہے۔ اس وقت وہ بے تابانہ طور پر خدا کا اعتراف کرنے لگتا ہے۔ مگر اکثر انسانوں کا یہ حال ہے کہ ان کا یہ اعتراف حالات کے دباؤ کے تحت ہوتا ہے نہ کہ حقیقۃً شعوری فیصلہ کے تحت۔ چنانچہ ایسے لوگ حالات بدلنے کے بعد کسی خود ساختہ توجیہہ کا سہارا لے کر خدا کو بھول جاتے ہیں اور دوبارہ اپنے آپ کو بے خدا زندگی پر راضی کر لیتے ہیں۔

اس دنیا میں لازمی طور پر حالات کا اتار چڑھاؤ پیش آتا ہے۔ یہ حالات ہر انسان کے لئے قدرت کا الارم ہیں۔ یہ الارم انسان کی سوئی ہوئی فطرت کو جگا دیتے ہیں۔ خوش قسمت انسان وہ ہے جو فطرت کی اس بیداری سے سچا سبق لے اور اپنی زندگی کو مستقل طور پر خدا پرستانہ زندگی بنا دے۔

10-042

خلافت ارضی

قرآن میں گزری ہوئی قوموں کا ذکر کیا گیا ہے اور پھر اس کے بعد ان کی جگہ لینے والی نئی قوموں کو خطاب کرتے ہوئے ارشاد ہوا ہے: پھر ہم نے ان کے بعد تم کو ملک میں جانشین بنایا تاکہ ہم دیکھیں کہ تم کیسا عمل کرتے ہو۔ (یونس ۱۴)

دنیا کی قوموں کا معاملہ سمندر اور پہاڑ جیسا نہیں ہے کہ ایک ہی قوم ہزاروں سال تک زمین پر آباد رہے۔ بلکہ تھوڑی تھوڑی مدت کے بعد لوگ مرتے رہتے ہیں اور ایک قوم کے بعد دوسری قوم زمین پر آباد ہوتی ہے اور اپنا اقتدار قائم کرتی ہے۔ اسی انسانی نظام کو قرآن میں خلافت کہا گیا ہے، یعنی ایک کا جانا اور اس کے بعد دوسرے کا اس کی جگہ لینا۔

اس دنیا میں کسی قوم کو خلیفہ (بااقتدار جانشین) بنانا اعزاز کے لئے نہیں بلکہ امتحان کے لئے ہوتا ہے۔ جانشین بنانے کا مطلب ایک کے بعد دوسرے کو کام کا موقع دینا ہے، ایک قوم کے بعد دوسری قوم کو امتحان کے میدان میں کھڑا کرنا ہے۔

مثال کے طور پر ہندستان میں پہلے مختلف دیسی راجا حکومت کر رہے تھے اس کے بعد ان کی جگہ مغلوں کو یہ منصب دیا گیا۔ پھر ان کو ہٹا کر انگریز ان کے جانشین بنائے گئے۔ اس کے بعد انھیں ملک سے نکال کر اس ملک کے اکثریتی فرقہ کے لئے جگہ خالی کی گئی۔ ان میں سے ہر بعد کو آنے والا اپنے پہلے کا خلیفہ (سیاسی جانشین) تھا۔

خلافت یا سیاسی جانشینی دراصل امتحان کا پرچہ ہے۔ اس دنیا میں آنے والا ہر انسانی گروہ خدا کی طرف سے زیر امتحان ہے۔ ہر گروہ کو بہر حال آزمائش کے مرحلہ سے گزرنا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس دنیا میں خلافت یا سیاسی اقتدار مستقل طور پر کسی ایک گروہ کو نہیں ملتا بلکہ وہ بار بار بدلتا رہتا ہے تاکہ باری باری ہر ایک کا امتحان لیا جا سکے۔

10-043

شفاء قلب

قرآن میں اس کتاب ہدایت کے نزول کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد ہوا ہے: اے لوگو، تمہارے پاس تمہارے رب کی جانب سے نصیحت (خدا کی کتاب) آگئی اور اس کے لئے شفاء جو سینوں میں ہوتا ہے اور اہل ایمان کے لئے ہدایت اور رحمت۔ (یونس ۵۷)

حدیث میں آیا ہے کہ ایک شخص رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا۔ اس نے کہا کہ مجھے اپنے

دل سے شکایت ہے۔ آپ نے فرمایا تم قرآن پڑھا کرو۔ اس کے بعد آپ نے قرآن کی مذکورہ آیت تلاوت فرمائی (**جاء رجل الی النبی ﷺ و قال انی اشتکی صدری ، قال اقرأ القرآن یقول الله تعالی و شفاء لما فی الصدور) التفسیر المظهری المجلد الخامس، ۳۵**۔

قرآن دل کی بیماری کے لئے شفاء ہے ـــــ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو آدمی سچا طالب ہو، وہ جب قرآن کو پڑھے گا تو قرآن کے صفحات میں اس کو اپنے ذہنی سوالات کا جواب اور قلبی بیماریوں کا علاج معلوم ہوتا رہے گا۔ مثال کے طور پر ایک شخص کو خدا کے وجود کے بارے میں شک ہے۔ وہ اپنے اس ذہن کو لے کر قرآن کو پڑھنا شروع کرتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ اس آیت پر پہنچتا ہے " **أ فی الله شكّ فاطر السموات والارض**" (ابراہیم ۱۰) وہ جب اس آیت پر غور کرے گا تو اس کو اس آیت میں خدا کے وجود کا خالص عقلی ثبوت مل جائے گا۔ اس طرح یہ آیت اس کے شک کو یقین میں بدلنے کا ذریعہ بن جائے گی (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو، تذکیر القرآن، ۵۴۲)

اسی طرح ایک شخص کسی اشتعال انگیز بات پر غضبناک ہو گیا ہے اس کے دل میں انتقام کی آگ بھڑک رہی ہے۔ اب وہ قرآن پڑھنا شروع کرتا ہے یہاں تک کہ وہ اس آیت پر پہنچتا ہے "**واذا ما غضبوا هم یغفرون**" (الشوریٰ ۳۷) جب وہ اس آیت پر سنجیدگی کے ساتھ غور کرے گا تو وہ اس میں زندگی کا ایک نہایت اہم نکتہ پا جائے گا۔ وہ یہ کہ اشتعال انگیزی کا جواب غضبناک ہونا نہیں ہے بلکہ اس کو نظر انداز کر دینا ہے۔ اسی روش میں انسان کی فلاح کا راز چھپا ہوا ہے۔

ایک شخص کو کسی سے ظلم و زیادتی کا تجربہ ہوتا ہے۔ وہ ظاہری واقعات کی بناء پر اس کو اپنی محرومی کا ذمہ دار سمجھ لیتا ہے۔ وہ چاہنے لگتا ہے کہ اس کے خلاف احتجاج اور حقوق طلبی کی مہم چلائے۔ اب وہ اس معاملہ میں قرآن سے رجوع کرتا ہے۔ قرآن کو پڑھتے ہوئے وہ اس آیت پر پہنچتا ہے " **وما اصابکم من مصیبة فبما کسبت ایدیکم**" (الشوریٰ ۳۰) یہ آیت اس کو

جھنجھوڑتی ہے، وہ معاملہ پر از سر نو غور کرنا شروع کرتا ہے۔ یہاں تک کہ اس پر کھلتا ہے کہ اس کے ساتھ جو کچھ پیش آیا وہ صرف اس کی داخلی کمی کی بنا پر پیش آیا ہے۔ ایسی حالت میں کسی مفروضہ دشمن کے خلاف شور وغل کا کوئی فائدہ نہیں۔ اس سے سبق لے کر وہ اپنی داخلی کمی کو دور کرنے میں لگ جاتا ہے یہاں تک کہ وہ کامیاب ہو جاتا ہے۔

اس طرح ایک شخص کے ساتھ کوئی ناخوشگوار تجربہ پیش آتا ہے۔ مثلاً اس کی بیوی بظاہر اس کی پسند کے مطابق نہیں۔ وہ اس طرح کے تجربہ کی تلخ یاد اپنے سینہ میں لئے ہوئے ہے۔ اس کے بعد وہ قرآن پڑھتا ہے، قرآن کو پڑھتے ہوئے وہ اس آیت تک پہنچتا ہے "**وعسی ان تکرھوا شیئاً و ھو خیر لکم وعسی ان تحبوا شیئاًوھو شر لکم** (البقرہ ۲۱۶)

یہ آیت اس کو سوچنے کا ایک نیا رخ دے دیتی ہے۔ اس پر غور کرتے ہوئے وہ اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ ظاہری پسند اور ظاہری ناپسند کی حیثیت بالکل اضافی ہے۔ محض ظاہر کی بنیاد پر کسی چیز کے بارے میں صحیح رائے قائم نہیں کی جاسکتی۔ عین ممکن ہے کہ ظاہر کے اعتبار سے کوئی چیز اچھی نہ لگتی ہو، مگر اپنی داخلی حقیقت کے اعتبار سے اس کے اندر کوئی بہت بڑی خوبی موجود ہو۔ جب اس کا ذہن اس طرح سوچے گا تو عین ممکن ہے کہ وہ جس چیز کو بظاہر ناپسندیدہ چیز سمجھے ہوئے تھا، اس کے اندر اس کو کوئی ایسا پسندیدہ پہلو مل جائے جو اتنا زیادہ قیمتی ہو کہ اس کی ظاہری ناپسندیدگی اس کو غیر اہم دکھائی دینے لگے۔

اسی طرح ایک انسان جس کو قلبی سکون حاصل نہیں۔ اس نے محنت کر کے اپنا ایک گھر بنایا۔ اس نے لمبی جدوجہد کے بعد اپنی ایک اقتصادی دنیا تعمیر کی۔ اس نے ایک پسندیدہ خاتون سے نکاح کیا، اس سے اس کے یہاں کئی بچے پیدا ہوئے۔ اس کا گھر بھرپور خاندان والا گھر بن گیا۔ ان سب کے باوجود وہ محسوس کر رہا ہے کہ اس کو حقیقی معنوں میں خوشی اور سکون حاصل نہیں۔ وہ اب بھی اسی بے چینی میں جی رہا ہے۔ اب اس نے قرآن کو پڑھنا شروع کیا۔ قرآن کو پڑھتے ہوئے وہ اس آیت پر پہنچا: **ألا بذکر الله تطمئن القلوب**۔ (الرعد ۲۸) یہ آیت اس کو چونکاتی

ہے، وہ اس پر غور کرنا شروع کرتا ہے۔ یہاں تک کہ اس پر ایک ایسی حقیقت منکشف ہوتی ہے جس کو وہ اس سے پہلے جانتا نہ تھا۔ وہ یہ کہ سکون کے حصول کا ذریعہ مادی چیزیں نہیں ہیں۔ بلکہ اس کا ذریعہ صرف ایک ہے اور وہ خدا کا ذکر (یاد) ہے۔

اصل یہ ہے کہ انسان اپنی فطرت کے اعتبار سے ایک معیار پسند (idealist) مخلوق ہے۔ جب کہ دنیا کی تمام چیزیں اپنی نوعیت کے اعتبار سے معیار سے کم تر ہیں۔ ہر چیز نقص یا محدودیت کا شکار ہے۔ دنیا کی ہر چیز آدمی کو اس کی طلب سے کم دکھائی دیتی ہے۔ اس کے برعکس خدا آخری حد تک ایک کامل ہستی ہے۔ وہ ہر قسم کے نقص سے پاک ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آدمی کو سکون صرف اس وقت ملتا ہے جب کہ وہ خدا کو پالے، وہ اس کی یادوں میں زندگی گزارنے لگے۔

قرآن میں بلاشبہہ دلوں کے لئے شفاء ہے، مگر یہ شفاء صرف اس کے لئے ہے جو قرآن سے اپنے لئے رہنمائی کا طالب ہو۔ جو کھلے ذہن کے ساتھ قرآن کو پڑھے اور کسی شرط کے بغیر قرآن کے پیغام کو ماننے کے لئے تیار ہو۔ اس دنیا میں کوئی بھی مطلوب چیز صرف اس کے طالب کو ملتی ہے نہ کہ اس کو جو سرے سے اس کا طالب ہی نہیں۔

10-044

اللہ کے اولیاء

قرآن میں ارشاد ہوا ہے: سن لو، اللہ کے اولیاء کے لئے نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے اور ڈرتے رہے، ان کے لئے خوش خبری ہے دنیا کی زندگی میں بھی اور آخرت میں، اللہ کی باتوں میں کوئی تبدیلی نہیں، یہی بڑی کامیابی ہے۔ (یونس ۶۲۔۶۴)

اولیاء اللہ، قرآن کے مطابق، کسی پراسرار گروہ کا نام نہیں۔ یہ معلوم انسان ہیں اور ان کی صفات مذکورہ آیت میں بیان کر دی گئی ہیں۔ وہ صفات یہ ہیں کہ ــــ وہ صاحب ایمان ہوں، یعنی انھیں معرفت کے درجہ میں اللہ کا تعلق حاصل ہو جائے۔ وہ اپنی زندگی کے تمام معاملات میں وہ

منقول ہے۔ تفسیر القرطبی میں ہے: ای علی ادیان شتی، قاله مجاهد و قتادہ۔(القرطبی الجزء التاسع، صفحہ ۱۱۴)

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ صراط مستقیم یا دین حق صرف ایک ہے،اس کے سوا جو کچھ ہے، وہ گمراہی ہے۔(یونس ۳۲)ایسی حالت میں یہ سوال ہے کہ دنیا میں بہت سے دین کیوں۔ جب اللہ کے نزدیک ایک ہی دین ہے جو انسان کو جنت کی طرف لے جانے والا ہے تو اللہ تعالیٰ نے ایسا کیوں نہیں کیا کہ دنیا میں صرف ایک ہی دین ہوتا۔ دین حق کے سوا دوسرے ادیان یہاں سرے سے موجود ہی نہ ہوتے۔ تاکہ انسان غلط انتخاب کی گمراہی سے بچ جائے اور جنت کے راستہ پر چلنا اس کے لئے آسان ہو جائے۔

جواب یہ ہے کہ یہ اللہ کی اسکیم ہی نہیں۔ اللہ نے اس دنیا میں امتحان کا وہ طریقہ رکھا ہے جس کو تعلیمی اصطلاح میں اکتشافی طریقہ (discovery method) کہا جاتا ہے۔ یعنی مختلف اور متفرق چیزوں کو سامنے بکھیر دینا اور طالب علم کو یہ موقع دینا کہ وہ اپنی سمجھ کو استعمال کر کے ان کی ایک وحدت بنائے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے دنیا میں ایسا کیا کہ ایک دین حق کے ساتھ دوسرے بہت سے غیر صحیح ادیان کو زندہ رہنے کا موقع دیا۔ اب ہر انسان کو یہ کرنا ہے کہ وہ اپنی خداداد عقل کو استعمال کر کے صحیح اور غلط کے درمیان تمیز کرے۔ وہ ادیان باطلہ کو پہچان کر انھیں رد کرے اور دین حق کی معرفت حاصل کر کے اسے اختیار کر لے۔

اسی مصلحت کی بنا پر اللہ نے انسان کو بے اختیار مخلوق نہیں بنایا جیسا کہ دوسری مخلوقات کا معاملہ ہے۔ مثلاً حیوانات اپنی جبلت کے تابع ہیں اور جمادات قانونِ فطرت کے تابع۔ بلکہ انسان کو مکمل اختیار دے کر زمین پر آباد کیا گیا۔ انسان سے یہ مطلوب ہے کہ وہ کسی جبر کے بغیر خود اپنی آزادی سے حق کا راستہ اختیار کرے۔ وہ خود اپنے فیصلہ کے تحت ایک چیز کو چھوڑے اور خود اپنے فیصلہ کے تحت دوسری چیز کو اختیار کرے۔

خدا کی رحمت اس شخص کو ملتی ہے جو اپنے شعور کو اتنا جگائے کہ وہ امتحانی اختیار کے اندر

والوں کے لئے۔ (ھود، ۱۱۴)

انسان کی تخلیق اس طرح ہوئی ہے کہ اس سے بار بار غلطیاں سر زد ہوتی ہیں۔ وقتی اثرات کے تحت وہ گناہوں میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اسی کے ساتھ انسان کے اندر ضمیر کا مادہ رکھا گیا ہے۔ جب بھی انسان سے کوئی کوتاہی سر زد ہوتی ہے تو اس کا ضمیر جاگ اٹھتا ہے۔ وہ اس کو ملامت کرنے لگتا ہے کہ تم نے ایسا کیوں کیا۔

اب انسان کیا کرے۔ ایک طرف بشری تقاضے کے تحت اس سے ایک گناہ سر زد ہو چکا۔ دوسری طرف اس کا ضمیر اندر سے ملامت کر کے اس کو مسلسل بے چین کئے ہوئے ہے۔ مذکورہ آیت میں اسی مسئلہ کا حل بتایا گیا ہے۔ آدمی اس آیت پر عمل کر کے اپنے دل کے بوجھ کو ہلکا کر سکتا ہے۔ اسی کے ساتھ وہ اللہ سے اپنے تعلق کو دوبارہ قائم کر سکتا ہے۔

یہ قرآنی تدبیر کیا ہے، یہ ہے برائی کے بعد بھلائی کرنا۔ یہ بھلائی اسی طرح برائی کو دھو دے گی جس طرح پانی گندگی کو دھو دیتا ہے۔ اس بھلائی کی مختلف صورتیں ہیں۔ مثلاً دل سے توبہ کرنا، نماز پڑھنا، ذکر و دعا میں مشغول ہونا، مالی صدقہ کرنا، ضرورت مندوں کے کام آنا، اس آدمی کے حق میں نیک دعائیں کرنا جس کے ساتھ زیادتی ہو گئی ہو، وغیرہ۔

11-048

اختلاف کی حکمت

قرآن میں ارشاد ہوا ہے: اور اگر تیرا رب چاہتا تو لوگوں کو ایک ہی امت بنا دیتا مگر وہ ہمیشہ اختلاف میں رہیں گے سوا ان کے جن پر تیرا رب رحم فرمائے۔ اور اس نے اسی لئے ان کو پیدا کیا ہے۔ اور تیرے رب کی بات پوری ہوئی کہ میں جہنم کو جنوں اور انسانوں سے اکھٹے بھر دوں گا۔ (ہود ۱۱۹۔۱۱۸)

اس آیت میں جس اختلاف کا ذکر ہے، اس سے مراد مذہبی اختلاف ہے۔ یعنی دنیا میں مختلف مذاہب کا ہونا اور لوگوں کا الگ الگ مذہب اختیار کرنا۔ مجاہد اور قتادہ سے اس کی یہی تفسیر

10-046

جنت والے

قرآن میں ارشاد ہوا ہے: جو لوگ ایمان لائے اور جنھوں نے نیک عمل کئے اور اپنے رب کے سامنے عاجزی کی، وہی لوگ جنت والے ہیں۔ وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ (ہود ۲۳)

آیت میں اخبات کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں عاجزی کرنا۔ عربی میں کہتے ہیں "هو خبيت القلب" (وہ شکستہ دل ہے) یہی ایمان کا خلاصہ ہے۔ ایمان نہ کوئی وراثت ہے اور نہ کسی لفظی مجموعہ کی لسانی ادائیگی۔ ایمان ایک ذہنی دریافت ہے۔ آدمی جب اپنے سمع وبصر (بالفاظ دیگر شعور) کو استعمال کر کے خدا کو پاتا ہے اور اس کے مقابلہ میں اپنی حیثیت کا ادراک کرتا ہے تو اس وقت اس کے اوپر جو کیفیت طاری ہوتی ہے اسی کا نام عجز (اخبات) ہے۔ عجز خدا کے مقابلہ میں اپنی حیثیت واقعی کی پہچان کا لازمی نتیجہ ہے۔

ایمان، اخبات اور عمل صالح تینوں ایک ہی حقیقت کے مختلف پہلو ہیں۔ ایمان خدا کے وجود اور اس کی صفات کمال کی شعوری دریافت ہے۔ اخبات اس قلبی حالت کا نام ہے جو خدا کی دریافت کے نتیجہ میں لازماً آدمی کے اندر پیدا ہوتی ہے۔ عمل صالح اسی شعور اور اسی کیفیت سے پیدا ہونے والی خارجی صورت ہے۔ آدمی جب خدا کے ذہن سے سوچتا ہے۔ جب اس کا دل خدائی کیفیات سے بھر جاتا ہے تو اس کے عین فطری نتیجہ کے طور پر اس کی ظاہری زندگی خدا کی پسند والے اعمال میں ڈھل جاتی ہے۔ اسی کا نام عمل صالح ہے۔ جو شخص ایمان، اخبات اور عمل صالح کا پیکر بن جائے وہی خدا کا مطلوب انسان ہے۔ اور وہی وہ انسان ہے جس کو جنت کے ابدی باغوں میں بسایا جائے گا۔

10-047

سیئات کی تلافی

قرآن میں ارشاد ہوا ہے: اور تم نماز قائم کرو، دن کے دونوں حصوں میں اور رات کے کچھ حصہ میں۔ بے شک نیکیاں دور کرتی ہیں برائیوں کو۔ یہ یاد دہانی ہے یاد دہانی حاصل کرنے

روش اختیار کریں جو اللہ کے خوف کے تحت بنتی ہے۔ یہ صفات جن لوگوں کے اندر حقیقی طور پر پیدا ہو جائیں ان کو دنیا ہی میں ایک ربانی زندگی حاصل ہو جاتی ہے۔ وہ اللہ کی توفیق سے اس راستہ پر چل پڑتے ہیں جس کی آخری منزل جنت ہے۔ یہ اللہ کے اٹل قانون کے تحت ہوتا ہے۔ اس میں کبھی کوئی تبدیلی نہیں۔

اولیاء اللہ کا لفظ اسی طرح ایک معلوم شرعی لفظ ہے جس طرح مومن اور متقی کا لفظ۔ اولیاء اللہ کا درجہ کسی کو معلوم شرعی قوانین کے ذریعہ ملتا ہے نہ کہ کسی پراسرار نسبت کے ذریعہ۔

10-045

ہدایت و ضلالت

قرآن میں ہدایت و ضلالت کا قانون بتاتے ہوئے ارشاد ہوا ہے: اور کسی شخص کے لئے ممکن نہیں کہ وہ اللہ کی اجازت کے بغیر ایمان لائے۔ اور اللہ ان لوگوں پر گندگی ڈال دیتا ہے جو عقل سے کام نہیں لیتے۔(یونس ۱۰۰)

"کوئی شخص خدا کے اذن کے بغیر ایمان نہیں لا سکتا" کا مطلب یہ ہے کہ موجودہ دنیا میں کسی کو ایمان کی نعمت ملے گی تو اس طریقہ کی پیروی کر کے ملے گی جو خدا نے اس کے لئے مقرر کر دیا ہے۔ موجودہ دنیا میں ایمان کو پانے کا راستہ یہ ہے کہ آدمی ایمان کی دعوت کو اپنی عقل کے استعمال سے سمجھے۔ اللہ نے انسان کو عقل دی ہے۔ جس شخص کی عقل کے اوپر اس کی دنیوی مصلحتیں غالب آجائیں اس کی عقل گویا گندگی کی کیچڑ میں لت پت ہو گئی ہے۔ ایسے شخص کے لئے اس دنیا میں ایمان کی نعمت پانے کا کوئی امکان نہیں۔

انسان کو عقل اسی لئے دی گئی ہے کہ وہ اس کے ذریعہ حق اور باطل میں تمیز کرے۔ وہ عقل کو استعمال کر کے سچائی کو دریافت کرے۔ یہی اللہ کی طرف سے مقرر کیا ہوا حق کا راستہ ہے۔ جو لوگ اپنی عقل کو بے آمیز طور پر استعمال کریں گے وہ حق کو پائیں گے۔ اور جو لوگ اپنی خداداد عقل کو بے آمیز طور پر استعمال کرنے میں ناکام رہیں وہ حق کو پانے میں ناکام ہو جائیں گے۔

اپنی حقیقی بے اختیاری کو جان لے۔ وہ انسانی قدرت کے پردہ میں خدا کی قدرت کو دیکھ لے۔ یہ شعور ایسے آدمی سے سرکشی کی طاقت چھین لیتا ہے۔ حتی کہ اس کا یہ حال ہو جاتا ہے کہ جب خدا اپنی رحمت کو اس کا حق کہہ کر پیش کرے تو اس کا شعور حقیقت پکار اٹھے ـــــ خدایا یہ بھی تیری رحمتوں کا ہی ایک کرشمہ ہے۔ ورنہ میرا عمل تو کسی قیمت کا مستحق نہیں۔

یہ اکتشافی طریقہ غیر معمولی حکمت پر مبنی ہے۔ اسی کی وجہ سے انسانوں کے اندر سرگرمیاں وجود میں آتی ہیں۔ اسی کے ذریعہ فکری اور روحانی ترقی ہوتی ہے۔ اسی عمل کے ذریعہ یہ ممکن ہوتا ہے کہ انسانی شخصیت ابتدائی حالت سے ترقی کر کے اعلیٰ انسانی درجہ تک پہنچ سکے۔ اگر ایسا نہ ہو تو انسان بھی اسی طرح یکساں ذہنی حالت پر ٹھہر کر رہ جائے گا جیسا کہ ہم حیوانات کی مثال میں دیکھتے ہیں۔

12-049

حقیقت کا اعتراف

قرآن میں حضرت یوسف علیہ السلام کا قصہ تفصیل کے ساتھ بیان ہوا ہے۔ اس کے مطابق، قدیم مصر کی ایک معزز خاتون نے حضرت یوسف کو بہکانا چاہا، جو اس وقت ایک نوجوان تھے۔ حضرت یوسف اس کے بہکاوے میں نہیں آئے اور اپنے لئے پاکبازی کے طریقہ کا انتخاب کیا۔ اس پر وہ عورت بگڑ گئی اور اس نے ان پر الزام لگا کر انھیں قید خانہ بھجوا دیا۔ مگر بعد کو حقیقت کھلی اور یہ ثابت ہوا کہ حضرت یوسف بے قصور تھے۔

مذکورہ معزز خاتون اگر چہ مجبور نہ تھی تاہم اس کا ضمیر جاگ اٹھا اور اس نے صاف لفظوں میں کہا کہ اب حق کھل گیا۔ میں نے ہی اس کو پھسلانے کی کوشش کی تھی اور بلاشبہہ وہ سچا ہے۔ (یوسف ۵۱)

اس واقعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ مذکورہ مصری خاتون اگر چہ وقتی طور پر اپنے جذبات سے مغلوب ہو گئی تھی مگر اس کی فطرت زندہ تھی اور اس کے اندر انسانی صفات موجود تھیں۔ چنانچہ جب معاملہ واضح ہوا تو وہ پکار اٹھی کہ میں ہی غلطی پر تھی، اس معاملہ میں یوسف کی کوئی غلطی نہیں۔

یہ اعتراف سب سے بڑی انسانی صفت ہے۔ جس عورت یا مرد میں اعتراف کا مادہ ہو اس کو

کسی نہ کسی مرحلہ میں خدا کی مدد حاصل ہو گی اور وہ حق کو پا جائے گا۔ اس کے برعکس جو لوگ اعتراف کی انسانی صفت کھو دیں، وہ گمراہی میں جیتے رہیں گے اور آخر کار اسی حال میں مر جائیں گے۔

12-050

غیر مسلم حکومت میں

قرآن میں حضرت یوسف علیہ السلام کا جو قصہ بیان ہوا ہے، اس کا ایک جزء یہ ہے کہ مصر کا مشرک بادشاہ ایک خاص مرحلہ میں ان کی شخصیت سے متاثر ہو گیا اور ان کو اپنے قریبی معززین میں شامل کرنا چاہا۔ اس وقت حضرت یوسف نے گفتگو کے دوران بادشاہ سے کہا کہ: مجھ کو ملک کے خزانوں پر مقرر کر دو، میں نگہبان ہوں اور جاننے والا ہوں (یوسف ۵۵) بادشاہ نے اس کو منظور کر لیا۔ چنانچہ حضرت یوسف مصر کے اس مشرک بادشاہ کی حکومت میں ایک اعلیٰ وزیر کے منصب پر فائز ہو گئے۔

پیغمبر کے اس واقعہ سے یہ شرعی اصول اخذ ہوتا ہے کہ غیر مسلم حکومت کے تحت ایک مسلمان کے لئے ذمہ دارانہ عہدہ کو قبول کرنا اصولاً بالکل جائز ہے، حتی کہ حسب حال وہ ایسا بھی کر سکتا ہے کہ خود اپنی طرف سے اس حکومتی عہدہ پر اپنے تقرر کی تجویز پیش کرے۔

12-051

نصرت کا اصول

حضرت یوسف علیہ السلام کو ان کے سوتیلے بھائیوں نے کم عمری میں ایک اندھے کنویں میں ڈال دیا۔ سوداگروں کے ایک قافلہ نے ان کو کنویں سے نکالا اور مصر کے بازار میں لے جا کر انھیں غلام کی حیثیت سے بیچ دیا۔ اس کے بعد آپ کے ساتھ مختلف قسم کے واقعات پیش آئے جن کا ذکر قرآن میں (اور بائبل میں) آیا ہے۔ مختلف مرحلوں سے گزرتے ہوئے آخر کار وہ وقت آیا جب کہ ان کو مصر میں وہ اعلیٰ حیثیت حاصل ہو گئی جس کا قرآن میں اس طرح ذکر کیا گیا ہے: اور ہم نے یوسف کو ملک میں بااختیار بنا دیا وہ اس میں جہاں چاہے جگہ بنائے۔ ہم جس پر چاہیں اپنی

عنایت متوجہ کریں۔(یوسف ۵٦)

آخری مرحلہ میں پورے قصہ کا خلاصہ حضرت یوسف کی زبان سے ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: اور جو شخص تقویٰ اختیار کرے اور صبر کرے تو اللہ ایسے محسنین کا اجر ضائع نہیں کرتا۔ (یوسف ۹۰) تقویٰ یہ ہے کہ آدمی زندگی کی جدوجہد کے دوران ہمیشہ حق پر قائم رہے، وہ کسی بھی حال میں حق سے انحراف نہ کرے۔ دوسری چیز یہ کہ وہ زندگی کے مراحل میں صبر و تحمل سے کام لے۔ نتیجہ میں تاخیر کو دیکھ کر وہ بے صبر نہ ہو جائے۔ جو لوگ تقویٰ اور صبر کی ان دونوں صفتوں کے حامل ہوں وہ اللہ کے نزدیک محسنین، یعنی حسن عمل والے لوگ ہیں۔ ایسے لوگ بہر حال اللہ کی نصرت کے حق دار ٹھہریں گے اور آخر کار کامیابی کی منزل پر پہنچ جائیں گے۔

13-052

عروج وزوال کے اسباب

قوموں کا عروج وزوال فطرت کے ایک اٹل قانون کی بنیاد پر ہوتا ہے جو اللہ نے مقرر فرمایا ہے۔ یہ قانون اس آیت سے معلوم ہوتا ہے: بے شک اللہ کسی گروہ کے مابقوم کو نہیں بدلتا جب تک وہ اپنے ما بانفس کو نہ بدل ڈالے۔ اور جب اللہ کسی قوم پر کوئی آفت لانا چاہتا ہے تو پھر اس کے ہٹنے کی کوئی صورت نہیں اور اللہ کے سوا اس کے مقابلہ میں کوئی ان کا مددگار نہیں (الرعد ۱۱)

اس آیت میں مابقوم سے مراد قومی حالت ہے اور ما بانفس سے مراد اس کی انفرادی حالت ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی قوم کی اجتماعی حالت اس قوم کے افراد کی حالت سے بندھی ہوئی ہے۔ افراد کے اندر جتنی صلاحیت ہوگی اتنا ہی صالح معاشرہ ان کے درمیان ظہور میں آئے گا۔ اسی بات کو ایک حدیث رسول میں اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ: تم لوگ جیسے ہوگے ویسے ہی تمہارے حکمراں ہوں گے (کما تکونون، کذالك یؤمر علیکم) مشکاۃ المصابیح ۲/۱۰۹۷۔ گویا کہ فرد اور مجتمع (سماج) کے درمیان وہی نسبت ہے جو بیج اور فصل کے درمیان ہوتی

ہے۔ جیسا بیج ویسی ہی فصل، اسی طرح جیسے افراد ویسا ہی مجتمع۔

یہ قانون اتنا زیادہ اٹل ہے کہ اس میں کوئی استثناء نہیں۔ جس معاشرہ کے افراد کے اندر بگاڑ آجائے، وہ معاشرہ لازماً تباہ ہو کر رہتا ہے۔ اس قانون کی زد میں آنے کے بعد کسی بھی گروہ کے لئے بچنا ممکن نہیں۔

اس قانون سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اگر کسی معاشرہ کو بہتر معاشرہ بنانا ہے تو اس عمل کا آغاز کہاں سے ہوگا۔ یہ آغاز کامیاب طور پر صرف افراد کی اصلاح سے ہی ہو سکتا ہے۔ اس کے برعکس اگر معاشرہ کی سطح سے اصلاحی عمل کا آغاز کیا جائے تو خدا کی دنیا میں ایسے معکوس عمل کا انجام ناکامی کے سوا اور کچھ نہیں۔

13-053

نفع بخشی

قرآن میں ارشاد ہوا ہے: اللہ نے آسمان سے پانی اتارا۔ پھر نالے اپنی اپنی مقدار کے موافق بہہ نکلے۔ پھر سیلاب نے ابھرتے جھاگ کو اٹھالیا اور اسی طرح کا جھاگ ان چیزوں میں بھی ابھر آتا ہے جن کو لوگ زیور یا اسباب بنانے کے لئے آگ میں پگھلاتے ہیں۔ اس طرح اللہ حق اور باطل کی مثال بیان کرتا ہے۔ پس جھاگ تو سوکھ کر جاتا رہتا ہے اور جو چیز انسانوں کو نفع پہنچانے والی ہے وہ زمین میں ٹھہر جاتی ہے۔ اللہ اسی طرح مثالیں بیان کرتا ہے۔ (الرعد ۱۷)

اس آیت میں مادی تمثیل کے ذریعہ فطرت کے قانون کو بتایا گیا ہے۔ وہ قانون یہ ہے کہ اس دنیا میں قیام اور استحکام ان انسانوں کو ملتا ہے جو یہاں نفع بخشی کا ثبوت دیں۔ جو لوگ نفع بخشی کی صلاحیت کھو دیں، ان کے لئے خدا کی اس دنیا میں کوئی جگہ نہیں۔

ایک فرد کو اپنے خاندان میں نفع بخش بننا ہے۔ اسی طرح اس کو اپنے سماج میں نفع بخش بننا ہے، اس نفع بخشی کے بغیر کسی کو نہ اپنے خاندان میں عزت کی جگہ ملے گی اور نہ اپنے سماج میں۔ یہی معاملہ قومی زندگی اور بین الاقوامی زندگی کا ہے یہاں بھی وہی لوگ عزت کا مقام پائیں گے جو

اپنے کو نفع بخش ثابت کرسکیں۔

ایک نفع بخشی وہ ہے جو مادی معنی میں ہو۔ دوسری نفع بخشی وہ ہے جو اخلاقی معنی میں ہو۔ لیکن اس سے بڑی نفع بخشی یہ ہے کہ کوئی فرد یا گروہ دنیا والوں کو سچائی کا تحفہ پیش کرسکے۔

13-054

اطمینان قلب

قرآن میں ارشاد ہوا ہے: وہ لوگ جو ایمان لائے اور جن کے دل اللہ کی یاد سے مطمئن ہوتے ہیں۔ سنو، اللہ کی یاد ہی سے دلوں کو اطمینان حاصل ہوتا ہے۔ (الرعد ۲۸)

اس آیت میں ایمان سے مراد معرفت ہے اور ذکر سے مراد خدا کی پھیلی ہوئی نشانیوں پر غور کرنا ہے۔ ذکر اللہ کی تشریح کے تحت تفسیر قرطبی میں ایک قول یہ نقل کیا گیا ہے کہ یعنی وہ اللہ کو یاد کرتے ہیں اور اس کی نشانیوں پر غور کرتے ہیں۔ پھر وہ اللہ کے کمالات کو اپنی بصیرت سے پہچان لیتے ہیں اور اس سے ان کے دل کو اطمینان حاصل ہوتا ہے۔ (وقیل، بذکر اللہ) أی یذکرون اللہ ویتأملون آیاته فیعرفون کمال قدرته عن بصیرته) تفسیر القرطبی ۹/ ۳۱۵

دل کا اطمینان کیا ہے۔ دل کا اطمینان یہ ہے کہ آدمی اس چیز کو پالے جس کو وہ پانا چاہتا تھا۔ اس کے برعکس دل کی بے اطمینانی یہ ہے کہ آدمی اس چیز کو پانے سے محروم رہے جس کو پانے کا شوق وہ اپنے دل میں لئے ہوئے تھا۔ اللہ کو چھوڑ کر کوئی آدمی دنیا کی جن چیزوں میں اطمینان ڈھونڈتا ہے وہ سب کی سب محدود اور ناقص ہیں۔ وہ انسان کی اصل طلب سے بہت زیادہ کم ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دنیوی یا مادی چیزوں کا پانا آدمی کو مطمئن نہیں کرتا۔ پانے سے پہلے آدمی ان چیزوں کے بارے میں بھرم میں رہتا ہے۔ مگر پانے کے بعد اس کا یہ بھرم ٹوٹ جاتا ہے۔ اس کا حال یہ ہوجاتا ہے گویا کہ پانا اور نہ پانا دونوں اس کے لئے برابر تھا۔

مگر اللہ کا معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ جب ایک آدمی اللہ کو دریافت کرتا ہے تو اس کو محسوس ہوتا ہے کہ اس نے اپنے طلب کے پورے جواب کو پالیا ہے۔ جب آدمی اللہ کو یاد کرتا

ہے اور روحانی سطح پر اللہ سے اس کا تعلق قائم ہوتا ہے تو یہ اس کی پوری شخصیت کے لئے ایک مکمل یافت کے ہم معنی بن جاتا ہے۔ کائنات کی نشانیوں میں جب وہ غور کرتا ہے تو اس میں اس کو اپنے فکری تقاضوں کا جواب مل جاتا ہے۔ یہی وہ اعلیٰ تجربہ ہے جس کو اس آیت میں اطمینان قلب سے تعبیر کیا گیا ہے۔

14-055

زیادتیوں پر صبر

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ پیغمبروں کی دعوتِ توحید کے بعد جب مدعو قوموں کی طرف سے منفی رد عمل سامنے آیا تو پیغمبروں کا جواب یہ تھا: اور ہم کیوں نہ اللہ پر بھروسہ کریں جب کہ اس نے ہم کو ہمارے راستے بتائے۔ اور جو تکلیف تم ہمیں دو گے ہم اس پر صرف صبر کریں گے۔ اور بھروسہ کرنے والوں کو اللہ ہی پر بھروسہ کرنا چاہئے (ابراہیم ۱۲)

تمام پیغمبروں کو اپنی مخاطب قوموں سے ایذارسانی کا تجربہ پیش آیا۔ تمام پیغمبروں کو ان کی قوم کے لوگ ہر طرح ستاتے رہے۔ مگر تمام پیغمبروں کا مشترک رویہ صرف ایک تھا، وہ ہے، ہر قسم کی زیادتیوں کو یک طرفہ طور پر برداشت کرتے ہوئے پرامن دعوت کا سلسلہ جاری رکھنا۔

اس کا سبب کیا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے، کہ دعوت کا کام ایک انتہائی مثبت کام ہے۔ وہ صرف ایسے ماحول میں جاری رہ سکتا ہے جہاں داعی اور مدعو کے درمیان اعتدال کی فضا مسلسل موجود رہے۔ اسی معتدل فضا یا پرامن ماحول کو برقرار رکھنے کے لئے تمام پیغمبر یک طرفہ طور پر صبر کرتے رہے۔ حقیقت یہ ہے کہ صبر ہی دعوت کی قیمت ہے، جہاں صبر نہیں وہاں دعوت بھی نہیں۔

بعد کے زمانہ میں جو لوگ دعوت کا کام کریں انھیں بھی صبر کی اس روش کو مکمل طور پر اختیار کرنا ہے۔ صبر کے بغیر دعوت کا کام نہ پچھلے زمانوں میں ہوا، اور نہ وہ آئندہ زمانوں میں ہو سکتا ہے۔ دعوت کی یہ ایک ایسی شرط ہے جو کبھی اور کسی کے لئے ساقط ہونے والی نہیں۔

14-056

درخت کی مثال

قرآن میں ارشاد ہوا ہے: کیا تم نے نہیں دیکھا، کس طرح مثال بیان فرمائی اللہ نے کلمۂ طیبہ کی۔ وہ ایک پاکیزہ درخت کی مانند ہے جس کی جڑ زمین میں جمی ہوئی ہے۔ اور جس کی شاخیں آسمان میں پہنچی ہوئی ہیں۔ وہ ہر وقت پر اپنا پھل دیتا ہے اپنے رب کے حکم سے اور اللہ لوگوں کے لئے مثال بیان کرتا ہے تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں۔ اور کلمۂ خبیثہ کی مثال ایک خراب درخت کی ہے جو زمین کے اوپر سے اکھاڑ لیا جائے۔ اس کو کوئی ثبات نہ ہو۔ اللہ ایمان والوں کو ایک پکی بات سے دنیا اور آخرت میں مضبوط کرتا ہے۔ اور اللہ ظالموں کو بھٹکا دیتا ہے۔ اور اللہ کرتا ہے جو وہ چاہتا ہے۔ (ابراہیم ۲۴۔۲۷)

موجودہ دنیا میں اللہ تعالیٰ نے مختلف حقیقتوں کی ظاہری تمثیلات قائم کی ہیں۔ شجرۂ طیبہ (اچھا درخت) ایک اعتبار سے مؤمن کی تمثیل ہے۔

درخت کی یہ عجیب خصوصیت ہے کہ وہ پوری کائنات کو اپنا غذائی دستر خوان بناتا ہے اور اس طرح بیج سے ترقی کر کے وہ ایک عظیم درخت کی صورت میں زمین کے اوپر کھڑا ہو جاتا ہے۔ درخت زمین سے پانی اور معدنیات اور نمکیات لے کر بڑھتا ہے۔ اسی کے ساتھ وہ ہوا اور سورج سے اپنے لئے غذا حاصل کرتا ہے۔ وہ نیچے سے بھی خوراک لیتا ہے اور اوپر سے بھی۔

یہی مومن کا معاملہ بھی ہے۔ عام درخت اگر ایک مادی درخت ہے تو مومن ایک شعوری درخت۔ مومن ایک طرف دنیا میں خدا کی تخلیقات اور اس کے نظام کو دیکھ کر عبرت اور نصیحت حاصل کرتا ہے۔ دوسری طرف "اوپر" سے اس کو مسلسل خدا کا فیضان پہنچتا رہتا ہے۔ وہ مخلوقات سے بھی اپنے لئے اضافۂ ایمان کی خوراک حاصل کرتا ہے اور خالق سے بھی اس کا قربت اور تعلق کا معاملہ جاری رہتا ہے۔

درخت ہر موسم میں اپنے پھل دیتا ہے۔ اسی طرح مومن ہر موقع پر وہ صحیح رویہ یا جواب

(response) ظاہر کرتا ہے جو اسے ظاہر کرنا چاہئے۔ معاشی تنگی ہو یا معاشی فراخی، خوشی کا لمحہ ہو یا غم کا، شکایت کی بات ہو یا تعریف کی بات، زور آوری کی حالت ہو یا بے زوری کی حالت، ہر موقع پر اس کی زبان اور اس کا کردار وہی رد عمل ظاہر کرتا ہے جو خدا کے سچے بندے کی حیثیت سے اسے ظاہر کرنا چاہئے۔

دوسری مثال شجرۂ خبیثہ (جھاڑ جھنکاڑ) کی ہے۔ اس کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ کائنات کی مذکورہ اعلیٰ خوراک سے محروم ہے جس کے نتیجہ میں اس کے اوپر کانٹے اگتے ہیں۔ اس کی شاخوں میں کڑوے اور بدمزہ پھل لگتے ہیں۔ اس کے پاس کوئی شخص جائے تو وہ بدبو سے اس کا استقبال کرتا ہے۔ ایسے درخت کو کوئی پسند نہیں کرتا۔ وہ جہاں اگے وہاں سے اس کو اکھاڑ کر پھینک دیا جاتا ہے۔

یہی معاملہ غیر مومن کا ہے۔ وہ زمین میں ایک غیر مطلوب وجود کی حیثیت سے اگتا ہے۔ کائنات اپنی تمام بہترین نشانیوں کے باوجود اس کے لئے ایسی ہو جاتی ہے کہ جیسے اس کے لئے یہاں نہ کوئی دلیل ہے اور نہ کوئی نصیحت۔ خدا کا فیضان اگرچہ ہر وقت برستا ہے مگر اس کو اس میں سے کوئی حصہ نہیں ملتا۔ اس کے کردار اور معاملات میں اس کا اظہار نہیں ہوتا۔

جو آدمی کلمۂ توحید کو اپنائے، اس کے لئے یہ کلمہ اس کی شخصیت کی تعمیر کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ وہ ایک ایسا انسان بن جاتا ہے جو خدا کا مطلوب انسان ہو۔ وہ دنیا میں خدا کی رحمتوں کو پائے اور آخرت میں جنت کا مستحق قرار دیا جائے۔

14-057

خدا کی نعمتیں

قرآن میں ارشاد ہوا ہے: اور اس نے تم کو ہر چیز میں سے دیا جو تم نے مانگا۔ اگر تم اللہ کی نعمتوں کو گنو تو تم گن نہیں سکتے۔ بے شک انسان بہت بے انصاف اور بڑا ناشکرا ہے۔ (ابراہیم ۳۴)

انسان جب دنیا میں پیدا ہوتا ہے تو اس کو کچھ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ اس کو کن کن

چیزوں کی ضرورت ہے۔ مگر بعد کو وہ حیرت انگیز طور پر پاتا ہے کہ یہاں اس کی ضرورت کی تمام چیزیں پیشگی طور پر موجود ہیں۔ زمین میں موافق قوت کشش، سورج اور ہوا اور پانی، ہوا میں آکسیجن کا ذخیرہ، زمین پر ہر قسم کی غذائیں، سفر کے لئے سواریاں، وغیرہ وغیرہ۔ اسی کے ساتھ زمین میں طرح طرح کی معدنیات جو کار اور ہوائی جہاز سے لے کر ٹیلیفون اور کمپیوٹر تک، انگنت چیزوں میں ڈھل سکتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر وہ چیز جو انسان کو اپنی راحت اور اپنی ضرورت کے لئے درکار تھی ان سب کو خدا نے پیشگی طور پر دنیا میں جمع کر دیا۔

یہ آیت قرآن کی صداقت پر ایک کھلی ہوئی دلیل ہے۔ نزول قرآن کے وقت اشیاء کائنات کے بارے میں انسان کی معلومات اتنی کم تھیں کہ انسان یقین کے ساتھ یہ کہنے کی پوزیشن میں نہیں تھا کہ اس دنیا میں خدا کی نعمتیں اتنی زیادہ ہیں کہ ان کی گنتی نہیں کی جا سکتی۔ نعمتوں کا انگنت ہونا اس وقت انسان کے لئے ایک نا معلوم بات تھی۔ یہ حقیقت پہلی بار صرف بیسویں صدی میں دریافت ہوئی۔ ایسی حالت میں دور سائنس سے پہلے کی ایک کتاب میں اس آیت کا ہونا ثابت کرتا ہے کہ وہ ایک خدائی کتاب ہے نہ کہ ایک انسانی کتاب۔ کیوں کہ انسان اپنی محدود واقفیت کی بنیاد پر چودہ سو سال پہلے ایسا بیان نہیں دے سکتا تھا۔ یہ صرف خالق کائنات ہے جو ان باتوں کا علم رکھتا ہے اور ان کے بارے میں ایسا بیان دے سکتا ہے جو بعد کے زمانے کے انقلابات سے درست ثابت ہوں۔

15-058

حفاظت قرآن

قرآن میں ارشاد ہوا ہے: یقیناً ہم نے ہی اس ذکر (قرآن) کو اتارا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔ (الحجر ۹)

قرآن ۶۱۰ء میں اترنا شروع ہوا۔ اس کا آخری حصہ ۶۳۲ء میں اترا۔ یہ پریس کے دور سے بہت پہلے کا زمانہ ہے۔ اس کے علاوہ اس وقت پیغمبر اور اہل ایمان کو مادی طاقتوں میں سے کوئی

طاقت حاصل نہ تھی۔ مزید یہ کہ مخالفتوں کی کثرت نے بظاہر سارے امکانات کو مسدود کر رکھا تھا۔ ایسی حالت میں قرآن کا یہ بیان کہ وہ مستقل طور پر باقی اور محفوظ رہے گا ایک نہایت غیر معمولی بیان تھا۔ ظاہری حالات کے اعتبار سے یہ ایک ناقابل قیاس واقعہ کی پیشین گوئی تھی۔ وہ تمام اسباب مستقبل کے اندھیروں میں چھپے ہوئے تھے جو حفاظت قرآن کو واقعہ بنانے کے لئے درکار تھے۔

اس اعتبار سے دیکھا جائے تو یہ آیت اس بات کا قطعی ثبوت ہے کہ قرآن خداوند عالم کی کتاب ہے۔ چنانچہ عین پیشین گوئی کے مطابق بعد کے زمانے میں ایک کے بعد ایک وہ تمام واقعات ظاہر ہوئے جو قرآن کی حفاظت کی یقینی ضمانت بن گئے۔ یہ سلسلہ جاری رہا یہاں تک کہ جدید پریس کا دور آ گیا جس کے بعد کسی کے لئے قرآن کو مٹانا عملاً ناممکن ہو گیا۔ مزید یہ کہ انتہائی استثنائی طور پر عربی زبان جو کہ قرآن کی زبان ہے، اپنی اصل ابتدائی حالت میں موجود رہی جب کہ نزول قرآن کے زمانے کی کوئی بھی زبان آج اپنی قدیم حالت میں موجود نہیں۔ (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو، مصنف کی کتاب: عظمتِ قرآن)

15-059

منتخب بندے

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ اللہ کے حکم کے باوجود، ابلیس نے آدم کے آگے سجدہ کرنے سے انکار کر دیا۔ اس کے بعد اللہ نے اس کو ہمیشہ کے لئے اپنی رحمت سے دور کر دیا۔ اس وقت شیطان نے یہ جواب دیا: ابلیس نے کہا، اے میرے رب، جیسا تو نے مجھے گمراہ کیا ہے اسی طرح میں زمین میں ان کے لئے مزین کروں گا اور سب کو گمراہ کر دوں گا سوا ان کے جو تیرے چنے ہوئے بندے ہیں۔ اللہ نے فرمایا، یہ ایک سیدھا راستہ ہے جو مجھ تک پہنچتا ہے۔ بے شک جو میرے بندے ہیں ان پر تیرا زور نہیں چلے گا۔ سوا ان کے جو گمراہوں میں سے تیری پیروی کریں۔ اور ان سب کے لئے جہنم کا وعدہ ہے۔ (الحجر ۳۹۔۴۳)

اس آیت کے مطابق، ہر انسان شیطان کی زد میں ہے۔ شیطان ہر انسان کو بہکا کر تباہی کی طرف لے جاتا ہے۔ اس معاملہ میں شیطان کا طریقہ کیا ہے، وہ تزئین ہے۔ یعنی غلط کام کو اچھا بنا کر پیش کرنا، برائیوں کو بھلائی کی صورت میں دکھانا، بربادی کے راستے کی ایسی تشریح کرنا کہ وہ کامیابی کا راستہ دکھائی دینے لگے۔ یہی تزئین انسان کے مقابلہ میں شیطان کا سب سے بڑا ہتھیار ہے۔

وہ کون لوگ ہیں جو شیطان کی اس تباہ کن تزئین سے بچ جائیں گے۔ یہ وہ منتخب انسان ہیں جو اپنے شعور کو اتنا زیادہ بیدار کر لیں کہ جب شیطان انھیں ایک غلط کام کو صحیح کام بنا کر دکھائے تو وہ اس سے متاثر نہ ہوں۔ وہ شیطان کی تزئین کا پردہ پھاڑ کر اصل حقیقت کو دیکھ لیں۔ وہ اپنی خداداد عقل کے ذریعہ معاملات کو سمجھیں نہ کہ شیطان کی ترغیبات کے ذریعہ۔

16-060

دین میں اختلاف

قرآن میں ارشاد ہوا ہے: اور ہم نے تم پر کتاب صرف اس لئے اتاری ہے کہ تم ان کو وہ چیز کھول کر سنا دو جس میں وہ اختلاف کر رہے ہیں اور وہ ہدایت اور رحمت ہے ان لوگوں کے لئے جو ایمان لائیں۔ اور اللہ نے آسمان سے پانی اتارا۔ پھر اس سے زمین کو اس کے مردہ ہونے کے بعد زندہ کر دیا۔ بے شک اس میں نشانی ہے ان لوگوں کے لئے جو سنتے ہیں (النحل ۶۴۔ ۶۵)۔ دوسرے مقام پر یہی بات اس طرح کہی گئی ہے: لوگ ایک امت تھے۔ انہوں نے اختلاف کیا تو اللہ نے پیغمبروں کو بھیجا خوش خبری دینے والے اور ڈرانے والے۔ اور ان کے ساتھ اتاری کتاب حق کے ساتھ تاکہ وہ فیصلہ کر دے ان باتوں کا جن میں لوگ اختلاف کر رہے ہیں۔ اور یہ اختلاف انہیں لوگوں نے کئے جن کو حق دیا گیا تھا، بعد اس کے کہ ان کے پاس کھلی کھلی ہدایات آچکی تھیں، آپس کی ضد کی وجہ سے۔ پس اللہ نے اپنی توفیق سے حق کے معاملہ میں ایمان والوں کو راہ دکھائی جس میں وہ جھگڑ رہے تھے۔ اور اللہ جس کو چاہتا ہے سیدھی راہ دکھاتا ہے۔ (البقرہ ۲۱۳)

خدا نے اپنے پیغمبروں کے ذریعہ جو دین بھیجا وہ ایک ہی دین ہے۔ پھر اتنے زیادہ پیغمبر کیوں آئے۔ اصل یہ ہے کہ جب ایک پیغمبر خدا کا دین لاتا ہے تو اس کے ابتدائی ماننے والے اس کو پیغمبر کی تشریح کے مطابق مانتے ہیں۔ بعد کی نسلوں میں تعبیر و تشریح میں اختلافات پیدا ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ ایک دین مختلف تشریحات کی صورت اختیار کر کے کئی دین بن جاتا ہے۔ ان میں سے ہر گروہ اپنے بنائے ہوئے دین کو صحیح اور دوسرے کو غلط کہنے لگتا ہے۔ اختلاف کے اس جنگل میں لوگوں کے لئے یہ سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے کہ کیا چیز حق ہے اور کیا چیز ناحق۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں یہی صورت پیدا ہو گئی تھی۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے پیغمبر اسلام کو بھیج کر یہ انتظام کیا تھا کہ لوگ مذہبی اختلاف کے جنگل کے درمیان خدا کے سچے راستے کو معلوم کر سکیں۔ یہی صورت حال آج بھی باقی ہے۔ ایک شخص خدا کے راستے کی تلاش میں ہو اور وہ مختلف مذاہب کا مطالعہ کرے تو وہ یقیناً ذہنی انتشار میں پڑ جائے گا۔ کیوں کہ مذاہب کی جو تعلیمات آج موجود ہیں ان میں باہم سخت اختلافات ہیں۔ چنانچہ حق کے متلاشی کی سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کس چیز کو صحیح سمجھے اور کس چیز کو غلط۔

ایسی حالت میں پیغمبر آخر الزماں کا لایا ہوا دین خدا کے بندوں کے لئے رحمت ہے۔ کیوں کہ دوسرے ادیان کے برعکس، آپ کا دین ایک محفوظ دین ہے۔ وہ تاریخی اعتبار سے پوری طرح مستند ہے۔ اس بنا پر پورا اعتماد کیا جا سکتا ہے کہ آپ نے جو دین چھوڑا وہی وہ حقیقی دین ہے جو خدا کو اپنے بندوں سے مطلوب ہے۔

تاہم تفسیر و تشریح میں اختلاف کا امکان بدستور باقی ہے۔ اس لئے پیغمبر آخر الزماں کے بعد بھی یہ صورت پیش آئے گی کہ اصل دین میں مختلف تعبیرات کر کے لوگ دوبارہ مختلف مذہبی دائروں میں بٹ جائیں۔ مگر آخری دین (اسلام) کا متن اب بھی پوری طرح محفوظ ہے۔ اس لئے آدمی اگر انسانی تشریحات سے الگ ہو کر براہ راست متن کے ذریعہ خدا کے دین کو سمجھنا چاہے تو وہ حقیقی دین کو پانے سے محروم نہیں رہ سکتا، بشرطیکہ وہ اس معاملہ میں پوری طرح سنجیدہ ہو۔

یہاں اس معاملے کو بارش کی مثال کے ذریعہ واضح کیا گیا ہے۔ بارش زمین کے ہر حصہ پر برستی ہے۔ مگر جو زرخیز زمین ہے اسی کو بارش سے فائدہ ہوتا ہے۔ بنجر زمین بارش کے باوجود بارش کے فائدے سے محروم رہتی ہے۔ یہی حال انسانوں کا ہے۔ جس آدمی نے اپنی استعداد کو زندہ رکھا ہو وہ اختلاف کے باوجود اصل دین کو پالے گا۔ اور جس آدمی کی استعداد مردہ ہو جائے وہ اختلافات میں الجھ کر رہ جائے گا۔ وہ اصل دین کو پانے میں ناکام رہے گا۔

16-061

وحی کی شہادت

قرآن میں ارشاد ہوا ہے: اور تمہارے رب نے شہد کی مکھی پر وحی کی کہ پہاڑوں اور درختوں اور جہاں ٹٹیاں باندھتے ہیں ان میں گھر بنا۔ پھر ہر قسم کے پھلوں کا رس چوس اور اپنے رب کی ہموار کی ہوئی راہوں پر چل۔ اس کے پیٹ سے پینے کی چیز نکلتی ہے، اس کے رنگ مختلف ہیں، اس میں لوگوں کے لئے شفا ہے۔ بے شک اس میں نشانی ہے ان لوگوں کے لئے جو غور کرتے ہیں۔ (النحل ٦٨-٦٩)

قرآن کی اس آیت میں شہد کی مکھی کے معاملہ کو بتانے کے لئے وحی کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ یہ اس بات کا اشارہ ہے کہ اگر انسان شہد کی مکھی کے معاملے پر غور کرے تو وہ پیغمبر پر آنے والی وحی کو بھی سمجھ سکتا ہے۔

شہد کی مکھی کی زندگی میں ایسی غیر معمولی نشانیاں ہیں جو اس حقیقت کو بتاتی ہیں کہ شہد کی مکھی کو یقینی طور پر خارج سے وحی جیسی رہنمائی دی جا رہی ہے، خارجی رہنمائی کے بغیر شہد کی مکھی خود سے ایسا نہیں کر سکتی۔ شہد کی مکھی جس طرح کام کرتی ہے اس میں اس نوعیت کی کثیر مثالیں پائی جاتی ہیں۔ مثلاً شہد کی مکھی کا چھتہ۔ شہد کی مکھی اپنا ہر چھتہ انتہائی صحت کے ساتھ اعلیٰ ریاضیاتی قوانین کی پابندی کرتے ہوئے بناتی ہے۔ اس کو یہ ریاضیاتی علم کس نے دیا۔ شہد کے ایک چھتے میں ہزاروں مکھیاں کام کرتی ہیں۔ ان کا یہ کام اتنے زیادہ منظم انداز میں ہوتا ہے جس کی مثال کسی بھی

انسانی کارخانے میں موجود نہیں۔ شہد کی مکھیوں کو یہ ڈسپلن کس نے سکھایا۔ یہ مکھیاں جب پھولوں کا رس لاکر اپنے چھتے میں جمع کرتی ہیں تو اسی کے ساتھ وہ انتہائی مناسب مقدار میں اس کے اندر ایک ایسا تحفظی مادہ (preservative) شامل کرتی ہیں جو شہد کو لمبی مدت تک خراب ہونے سے بچانے والا ہے۔ یہ فن شہد کی مکھی کو کس نے سکھایا۔ شہد کی مکھی شہد لانے کے لئے اکثر اپنے چھتے سے کئی کلو میٹر دور تک جاتی ہے۔ صبح کو جب وہ شہد لانے کے لئے اپنے چھتے سے روانہ ہوتی ہے تو وہ کسی قدر اندھیرے میں روانہ ہوتی ہے۔ لیکن شام کو جب وہ شہد لے کر آپنی آخری ٹرپ سے لوٹتی ہے تو وہ کسی قدر اجالے میں لوٹتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے ک صبح کو اس کا سفر اندھیرے سے اجالے کی طرف ہوتا ہے لیکن شام کو اجالے سے اندھیرے کی طرف۔ اس لئے صبح کو اگر وہ اندھیرے میں روانہ ہو تو اطمینان ہوتا ہے کہ تھوڑی دیر میں اجالا ہو جائے گا۔ اور راستے صاف دکھائی دینے لگیں گے۔ اس کے برعکس اگر وہ شام کو دیر سے واپس ہو تو اندیشہ ہے کہ جلد ہی اندھیرا ہو جائے اور وہ اپنے راستہ سے بھٹک جائے۔ صبح کی پہلی ٹرپ اور شام کی آخری ٹرپ میں فرق کرنے کا یہ شعور اس کو کس نے دیا۔

شہد کی مکھی کی کارکردگی میں اس طرح کی بہت سی انوکھی مثالیں پائی جاتی ہیں۔ یہ مثالیں ناقابل تردید طور پر ثابت کرتی ہیں کہ شہد کی مکھی کو خارجی وحی سے رہنمائی مل رہی ہے۔ اس طرح شہد کی مکھی کی وحی ثابت ہونے کے بعد پیغمبر کی وحی بھی یقینی طور پر ثابت ہو جاتی ہے۔ ایک کے ساتھ وحی کا امکان ثابت ہونے کے بعد دوسرے کے ساتھ وحی کا امکان اپنے آپ ثابت ہو جاتا ہے۔ دونوں میں ایک منطقی لزوم ہے جس سے انکار کسی بھی طرح ممکن نہیں۔

16-062

دین فطرت

قرآن میں ارشاد ہوا ہے: بے شک اللہ حکم دیتا ہے عدل کا اور احسان کا اور قرابت داروں کو دینے کا۔ اور اللہ روکتا ہے فحشاء سے اور منکر سے اور سرکشی سے۔ اللہ تم کو نصیحت کرتا ہے تاکہ

تم یاددہانی حاصل کرو۔ (النحل ۹۰)

دنیا میں کوئی اللہ کا بندہ کس طرح رہے، اس کا واضح بیان اس آیت میں موجود ہے۔ اس کے مطابق، پہلی چیز جس کا ایک شخص کو اہتمام کرنا ہے وہ عدل ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک شخص کا جو حق دوسرے پر آتا ہے وہ اس کو پوری طرح ادا کرے، خواہ صاحب حق کمزور ہو یا طاقت ور، اور خواہ وہ پسندیدہ شخص ہو یا ناپسندیدہ۔ حقوق کی ادائیگی میں صرف حق کا لحاظ کیا جائے نہ کہ دوسرے اعتبارات کا۔

دوسری چیز احسان ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ حقوق کی ادائیگی میں عالی ظرفی کا طریقہ اپنایا جائے۔ انصاف کے ساتھ مروت کو جمع کیا جائے۔ قانونی دائرہ سے آگے بڑھ کر لوگوں کے ساتھ فیاضی اور ہمدردی کا رویہ اختیار کیا جائے۔ آدمی کے اندر یہ حوصلہ ہو کہ حتی الامکان وہ اپنے لئے اپنے حق سے کم پر راضی ہو جائے، اور دوسرے کو اس کے حق سے زیادہ دینے کی کوشش کرے۔

تیسری چیز ایتاء ذی القربیٰ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آدمی جس طرح اپنے بیوی بچوں کی ضرورت کو دیکھ کر تڑپ اٹھتا ہے اور اس کو پورا کرتا ہے، اسی طرح وہ دوسرے قریبی لوگوں کی ضرورت کے بارے میں بھی حساس ہو۔ ہر صاحب استعداد شخص اپنے مال پر صرف اپنا اور اپنے گھر والوں ہی کا حق نہ سمجھے بلکہ اپنے رشتہ داروں کے حقوق ادا کرنے کو بھی وہ اپنی ذمہ داری میں شامل کرے۔

اس کے بعد آیت میں تین چیزوں سے منع کیا گیا ہے۔

پہلی چیز فحشاء ہے۔ اس سے مراد کھلی ہوئی اخلاقی برائیاں ہیں۔ یعنی وہ برائیاں جن کا برا ہونا خود اپنے ضمیر کے تحت ہر آدمی کو معلوم ہوتا ہے۔ اور لوگ عام طور پر اس کو شرمناک سمجھتے ہیں۔

دوسری چیز منکر ہے۔ منکر معروف کا الٹا ہے۔ معروف ان اچھی باتوں کو کہتے ہیں جن کو ہر معاشرے میں اچھا سمجھا جاتا ہے۔ اس کے برعکس منکر سے مراد وہ نامعقول کام ہیں جو عام اخلاقی معیار کے خلاف ہیں۔ اس میں وہ تمام چیزیں شامل ہیں جن کو انسان عام طور پر برا جانتے

ہیں اور جن کو قبول کرنے سے انسان کی فطرت انکار کرتی ہے۔

تیسری چیز بغی ہے۔ اس کے معنی ہیں حد سے تجاوز کرنا۔ اس میں ہر وہ سرکشی داخل ہے جب کہ آدمی اپنی واقعی حد سے گزر کر دوسرے شخص پر دست درازی کرے۔ وہ کسی کی جان یا مال یا آبرو لینے کے لئے اس کے اوپر ناحق کارروائیاں کرے۔ وہ اپنے زور واثر کو ناجائز فائدہ اٹھانے کے لئے استعمال کرنے لگے۔

اللہ تم کو نصیحت کرتا ہے تاکہ تم یاد دہانی حاصل کرو۔۔۔۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس آیت میں جو باتیں کہی گئی ہیں وہ خود فطرت انسانی کی آواز ہیں۔ آدمی اگر غور کرے تو وہ پائے گا کہ قرآن کی یہ تعلیم عین وہی ہے جس کی طلب پیشگی طور پر انسان کے اندر موجود تھی۔ قرآن کی اس بات کی حیثیت آدمی کو اس کی اپنی فطرت کی یاد دلانا ہے نہ کہ کسی خارجی حکم کو صرف اوپر سے نافذ کرنا۔ یہ احساس آدمی کو مجبور کرے گا کہ وہ قرآن کے پیغام کو خود اپنی فطرت کی آواز سمجھ کر قبول کرلے۔

16-063

یکساں معاملہ

قرآن میں ارشاد ہوا ہے: جو شخص کوئی نیک کام کرے، خواہ وہ مرد ہو یا عورت، بشرطیکہ وہ مومن ہو تو ہم اس کو زندگی دیں گے، ایک اچھی زندگی۔ اور جو کچھ وہ کرتے رہے اس کا ہم ان کو بہترین بدلہ دیں گے۔ (النحل ۹۷)

اسلام کے مطابق، عورت اور مرد کے درمیان میدانِ کار (workplace) کے اعتبار سے تو ضرور فرق ہے۔ مگر خدا کی نعمتوں میں حصہ دار بننے کے اعتبار سے دونوں میں کوئی فرق نہیں۔ کوئی بھی فرد، خواہ وہ مرد ہو یا عورت، اگر وہ معرفت خداوندی حاصل کرے اور اس کے مطابق وہ صالح کردار کا ثبوت دے تو دونوں یکساں طور پر اس خدائی رحمت کے مستحق قرار پائیں گے جو اس دنیا میں انسان کے لئے مقدر کی گئی ہے۔

اس خدائی رحمت کا پہلا حصہ یہ ہے کہ اس کو دنیا میں وہ زندگی حاصل ہو جو خدا کے نزدیک پاک زندگی (حیوۃ طیبہ) ہے۔ یعنی ہر موقع پر یہ توفیق ملنا کہ اس کے ذہن میں صحیح اور مثبت سوچ جگہ پائے۔ اسی طرح اس کو توفیق ملے کہ وہ ہر موقع پر وہ روش اختیار کرے جو اس دنیا میں ہر انسان کے لئے صحیح اور درست روش ہے۔ اس خدائی رحمت کا دوسرا حصہ وہ ہے جس کا ظہور آخرت میں ہوگا۔ یعنی اس کے ایمان اور اس کے عمل کو قبول کر کے ابدی جنت میں اس کا داخلہ۔

آیت کے مطابق، خدا کی یہ رحمت جس طرح ایک مرد کے لئے ہے، ٹھیک اسی طرح وہ ایک عورت کے لئے بھی ہے۔ نتیجہ کے اعتبار سے دونوں کے درمیان کوئی فرق نہیں۔ البتہ مرد کو اپنے دائرہ کار میں ایمان و عمل کا ثبوت دینا ہے اور عورت کو اپنے دائرہ کار میں۔

16-064

دعوت کا اسلوب

قرآن میں دعوت کا حکم دیتے ہوئے ارشاد ہوا ہے: اپنے رب کے راستہ کی طرف حکمت اور اچھی نصیحت کے ساتھ بلاؤ اور ان سے اچھے طریقہ سے بحث کرو۔ بے شک تمہارا رب خوب جانتا ہے کہ کون اس کی راہ سے بھٹکا ہوا ہے اور وہ ان کو بھی خوب جانتا ہے جو راہ پر چلنے والے ہیں۔ (النحل ۱۲۵)

اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ دعوت حق کا اسلوب کیا ہونا چاہئے۔ اس کو بتانے کے لئے قرآن میں تین لفظ استعمال کئے گئے ہیں ـــــ حکمت، موعظت حسنہ اور جدال احسن۔

حکمت سے مراد دلیل و برہان ہے۔ کوئی دعوتی عمل اسی وقت حقیقی دعوتی عمل ہے جب کہ وہ ایسے دلائل کے ساتھ ہو جس میں مخاطب کے ذہن کی پوری رعایت شامل ہو۔ مخاطب کے نزدیک، کسی چیز کے ثابت شدہ ہونے کی جو شرائط ہیں، ان شرائط کی تکمیل کے ساتھ جو کلام کیا جائے اسی کو یہاں حکمت کا کلام کہا گیا ہے۔ جس کلام میں مخاطب کی ذہنی و فکری رعایت شامل نہ ہو وہ غیر حکیمانہ کلام ہے۔ اور ایسا کلام کسی کو داعی کا مرتبہ نہیں دے سکتا۔

موعظت حسنہ اس خصوصیت کا نام ہے جو دردمندی اور خیر خواہی کی نفسیات سے کسی کے کلام میں پیدا ہوتی ہے۔ جس داعی کا حال یہ ہو کہ خدا کی عظمت و جلال کے احساس سے اس کی شخصیت کے اندر بھونچال آگیا ہو، جب وہ خدا کے بارے میں بولے گا تو یقینی طور پر اس کے کلام میں عظمت خداوندی کی بجلیاں چمک اٹھیں گی۔ جو داعی جنت اور جہنم کو دیکھ کر دوسروں کو اسے دکھانے کے لئے اٹھے اس کے کلام میں یقینی طور پر جنت کی بہاریں اور جہنم کی ہولناکیاں گونجتی ہوئی نظر آئیں گی۔ ان چیزوں کی آمیزش داعی کے کلام کو ایسا بنادے گی جو دلوں کو پگھلا دے اور آنکھوں کو اشک بار کردے۔

دعوتی کلام کی اصل خصوصیات یہی دو ہیں ـــــ حکمت اور موعظت حسنہ۔ تاہم ہمیشہ دنیا میں کچھ ایسے لوگ موجود رہتے ہیں جو غیر ضروری بحثیں کرتے ہیں۔ جن کا مقصد الجھانا ہوتا ہے نہ کہ سمجھنا اور سمجھانا۔ ایسے لوگوں کے بارے میں ایک سچا داعی جو انداز اختیار کرتا ہے، اسی کا نام جدال احسن ہے۔ وہ ٹیڑھی بات کا جواب سیدھی بات سے دیتا ہے۔ وہ سخت الفاظ سن کر بھی اپنی زبان سے نرم الفاظ نکالتا ہے۔ وہ الزام تراشی کے مقابلہ میں صبر کا اسلوب اختیار کرتا ہے۔

داعیٔ حق کی نظر سامنے کے انسان کی طرف نہیں ہوتی بلکہ اس خدا کی طرف ہوتی ہے جو سب کے اوپر ہے۔ اس لئے وہ وہی بات کہتا ہے جو خدا کی میزان میں حقیقی بات ٹھہرے اور جس کے لئے اسے خدا کے یہاں شرمندہ ہونا نہ پڑے۔

16-065

داعیانہ کردار

قرآن میں ارشاد ہوا ہے: اور اگر تم بدلہ لو تو اتنا ہی بدلہ لو جتنا تمہارے ساتھ کیا گیا ہے اور اگر تم صبر کرو تو وہ صبر کرنے والوں کے لئے بہت بہتر ہے (النحل ۱۲۶)

اس آیت میں داعی کا وہ کردار بتایا گیا ہے جو مخالفین کے مقابلہ میں اس کو اختیار کرنا ہے۔ فرمایا کہ اگر مخالفین کی طرف سے ایسی تکلیف پہنچے جس کو تم برداشت نہ کرسکو تو تم کو اتنا ہی کرنے

کی اجازت ہے جتنا تمہارے ساتھ کیا گیا ہے۔ تاہم یہ اجازت صرف انسان کی کمزوری کو دیکھتے ہوئے بطور رعایت ہے۔ ورنہ داعی کا اصل کردار تو یہ ہونا چاہئے کہ وہ مدعو کی طرف سے پیش آنے والی ہر تکلیف پر صبر کرے۔ وہ مدعو سے حساب چکانے کے بجائے ایسے تمام معاملات کو خدا کے خانہ میں ڈال دے۔

مخاطب اگر حق کو نہ مانے۔ وہ اس کو مٹانے کے درپے ہو جائے تو اس وقت داعی کو سب سے بڑی تدبیر جو کرنی ہے وہ صبر ہے۔ یعنی رد عمل کی نفسیات یا جوابی کارروائیوں سے بچتے ہوئے مثبت طور پر حق کا پیغام پہنچاتے رہنا۔

17-066

خدائی نشانیوں کا تجربہ

قرآن میں پیغمبر اسلام ﷺ کے سفر معراج کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد ہوا ہے: پاک ہے وہ جو لے گیا ایک رات اپنے بندے کو مسجد حرام سے دور کی اس مسجد تک جس کے ماحول کو ہم نے بابرکت بنایا ہے تاکہ ہم اس کو اپنی بعض نشانیاں دکھائیں۔ بے شک وہ سننے والا، دیکھنے والا ہے (بنی اسرائیل ۱)

قرآن کی اس آیت میں جس واقعہ کا ذکر ہے، وہ غالباً ہجرت سے ایک سال پہلے پیش آیا۔ اس وقت پیغمبر اسلام ﷺ مکہ میں تھے۔ رات کے وقت پر اسرار طور پر خدا کے فرشتہ نے آپ کو مکہ سے یروشلم پہنچایا۔ اس سفر کی ابتدائی منزل مسجد اقصیٰ (دور کی مسجد) تھی۔ یہ دراصل وہ جگہ (site) ہے جہاں پہلے ہیکل سلیمان واقع تھا۔ اس ہیکل (عبادت گاہ) کو حضرت سلیمان نے ۱۰۰۴ ق م میں بنوایا تھا۔ اس کے بعد بابل کے بادشاہ بخت نصر نے ۵۸۶ ق م میں اس کو تباہ کر دیا۔ اس کے بعد اسرائیلی پیغمبر عذراہ اور نحمیاہ نے اس کو تقریباً ۵۱۵ ق م میں دوبارہ تعمیر کیا۔ اس کے بعد تیتس رومی اپنی فوجوں کے ساتھ ۷۰ء میں یروشلم آیا اور اس نے پورے ہیکل کو توڑ کر اس کو کھنڈر بنا دیا۔

جب پیغمبر اسلام کا سفر معراج ہوا تو یہ مقام غالباً اسی طرح کھنڈر کی حالت میں تھا۔ کیوں کہ یہودیوں کا یہ عقیدہ تھا کہ ہیکل (عبادت گاہ) کی تعمیر صرف خدا کا پیغمبر ہی کر سکتا ہے۔ اس حادثہ کے بعد چونکہ ایسا کوئی پیغمبر ان کے یہاں نہیں آیا جو اس کی از سر نو تعمیر کرے۔ اس لئے وہ جگہ اسی ویران حالت میں پڑی رہی۔ روایات کے مطابق، پیغمبر اسلام کے اس سفر کے موقع پر تمام پچھلے پیغمبر اکٹھا ہوئے۔ انہوں نے اس جگہ نماز باجماعت ادا کی اور پیغمبر اسلام نے اس کی امامت فرمائی۔

یہ سفر جس کو قرآن میں اسراء کہا گیا ہے، اس کے بارے میں ایک مسئلہ یہ ہے کہ اس میں لنریہ من آیاتنا (تاکہ ہم اس کو اپنی بعض نشانیاں دکھائیں) کا مطلب کیا ہے۔ عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ اس سے مراد وہ نشانیاں ہیں جو مسجد اقصیٰ یا یروشلم کے آس پاس موجود ہیں۔ یعنی سابق پیغمبروں کے آثار اور زمینی شادابی وغیرہ۔ مگر زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ اس کو اس غیر معمولی سفر سے متعلق مانا جائے۔ جیسا کہ خود آیت میں ارشاد ہوا ہے (**سبحان الذی اسری بعبده ليلاً من المسجدالحرام إلى المسجد الأقصى**)۔

اسراء کے اس واقعہ کا سب سے زیادہ اہم پہلو یہ ہے کہ وہ ایک بے حد تیز رفتار سفر کی صورت میں ہوا۔ اس "نشانی" کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے اس جدید امکان کا پیشگی تعارف کرایا جو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے دور نبوت میں ظاہر ہونے والا تھا۔ یعنی وہی چیز جس کو آج جدید مواصلات (Modern Communication) کہا جاتا ہے۔ موجودہ زمانہ میں فطرت کی جو نئی طاقتیں انسان کے قبضہ میں آئی ہیں انہوں نے اس بات کو ممکن بنا دیا ہے کہ انسان انتہائی تیز رفتاری کے ساتھ سفر کرے، وہ اپنے پیغامات کو ایک لمحہ کے اندر دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پہنچا دے۔

پیغمبر اسلام ﷺ سارے اہل عالم کے لئے نذیر و بشیر بنا کر بھیجے گئے تھے (الفرقان ۱) آپ کی بعثت کی اس عالمی نوعیت کا تقاضہ تھا کہ آپ کے پیروؤں کو وہ اسباب دئے جائیں جن کے

ذریعہ وہ نسل در نسل آپ کے دین کی عالمی اشاعت کر سکیں۔ مذکورہ ذمہ داری کی ادائیگی اس کے بغیر ممکن نہ تھی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے پیغمبر اسلام کے بعد ایسے حالات پیدا کئے جن کے نتیجہ میں مواصلات کا نیا دور دنیا میں آ گیا۔

پیغمبر اسلام ﷺ کے زمانہ میں اونٹ پر سفر ہوتا تھا۔ چنانچہ ایک شخص کو مکہ سے یروشلم تک پہنچنے کے لئے ایک مہینہ سے زیادہ لمبی مدت درکار ہوتی تھی۔ مگر اب جدید انقلاب نے اس معاملہ کو یکسر بدل دیا ہے۔ پیغمبر اسلام کا یہ تیز رفتار سفر گویا کمیونیکیشن کے نئے دور کا افتتاح تھا جو خود آپ کے دین کے لئے پیشگی بشارت کے طور پر کرایا گیا۔

17-067

خوش حال طبقہ

قرآن میں ارشاد ہوا ہے: اور جب ہم کسی بستی کو ہلاک کرنا چاہتے ہیں تو اس کے خوش حال لوگوں کو حکم دیتے ہیں، پھر وہ اس میں نافرمانی کرتے ہیں۔ تب ان پر بات ثابت ہو جاتی ہے۔ پھر ہم اس بستی کو تباہ و برباد کر دیتے ہیں۔ (بنی اسرائیل ۱۶)

یہ قرآن کے مخصوص اسلوب میں فطرت کے ایک قانون کا بیان ہے۔ وہ یہ کہ کسی قوم کے بننے اور بگڑنے کا انحصار اس کے طبقۂ خواص پر ہوتا ہے، نہ کہ طبقۂ عوام پر۔ یہی وجہ ہے کہ پیغمبر ہمیشہ اپنے دعوتی اور اصلاحی عمل کا نشانہ خواص کو بناتے ہیں۔ عوام کو اپنے دعوتی عمل کا اصل نشانہ بنانا پیغمبرانہ سنت کے مطابق نہیں۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ کسی قوم کی اصلاح یا کسی قوم کے بگاڑ کا معیار اس قوم کا خوش حال اور سربرآوردہ طبقہ ہوتا ہے۔ یہی طبقہ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کا مالک ہوتا ہے۔ یہی طبقہ اپنے وسائل کے ذریعہ لوگوں پر اثر انداز ہونے کی طاقت رکھتا ہے۔ یہی طبقہ اس قابل ہوتا ہے کہ وہ کسی گروہ کے اوپر قائد بننے کی قیمت ادا کر سکے۔

یہی وجہ ہے کہ کسی قوم کے سربرآوردہ طبقہ کی اصلاح پوری قوم کی اصلاح ہے اور کسی

قوم کے سر برآوردہ طبقہ کا بگاڑ پوری قوم کا بگاڑ۔

17-068

دنیا مقصودِ اصلی نہیں

قرآن میں ارشاد ہوا ہے: جو شخص عاجلہ کو چاہتا ہو، اس کو ہم اس میں سے دے دیتے ہیں، جتنا ہم جس کو دینا چاہیں۔ پھر ہم نے اس کے لئے جہنم ٹھہرا دی ہے، وہ اس میں داخل ہو گا بد حال اور راندہ ہو کر۔ اور جس نے آخرت کو چاہا اور اس کے لئے دوڑ کی جو کہ اس کی دوڑ ہے اور وہ مومن ہو تو ایسے لوگوں کی کوشش مقبول ہو گی۔ ہم ہر ایک کو تیرے رب کی بخشش میں سے پہنچاتے ہیں، ان کو بھی اور ان کو بھی۔ اور تیرے رب کی بخشش کسی کے اوپر بند نہیں۔ (بنی اسرائیل ۱۸۔۲۰)

دنیا میں زندگی گزارنے کے دو طریقے ہیں۔ ایک ہے، دنیا کے ذریعہ دنیا کو حاصل کرنا۔ دوسرا ہے، دنیا کے ذریعہ آخرت کو حاصل کرنا۔ یہ دونوں ہی مواقع ہر آدمی کے لئے یکساں طور پر کھلے ہوئے ہیں۔ یہ آدمی کا اپنا کام ہے کہ وہ دونوں میں سے کس کو لیتا ہے اور کس کو چھوڑ دیتا ہے۔ آدمی کو ایک ایسا وجود دیا گیا ہے جو نہایت اعلیٰ ذہنی اور جسمانی صلاحیتوں کا مالک ہے۔ دوسری طرف خارجی دنیا میں ہر قسم کے اسباب وافر مقدار میں موجود ہیں۔ کوئی آدمی دونوں میں سے جس مقصد کو اپنا نشانہ بنائے، تمام اسباب فوراً اس کا ساتھ دینے لگتے ہیں۔ اسباب خود سے کبھی ایسا نہیں کہتے کہ ہم کو فلاں مقصد کے لئے استعمال کرو اور فلاں مقصد کے لئے استعمال نہ کرو۔

یہ صورت حال آدمی کو اکثر غلط فہمی میں ڈال دیتی ہے۔ حالات کی مساعدت کو دیکھ کر وہ سمجھ لیتا ہے کہ میں جو کچھ کر رہا ہوں وہ ٹھیک کر رہا ہوں۔ مگر یہی وہ مقام ہے جہاں آدمی کا امتحان ہو رہا ہے۔ آدمی کو ایسا نہیں کرنا چاہئے کہ وہ صرف اس لئے اپنے آپ کو درست سمجھ لے کہ وہ بظاہر ترقی اور کامیابی کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اس کے بجائے ہر آدمی کو یہ کرنا ہے کہ وہ اصول حق کو

معیار بنائے اور اس کی روشنی میں اپنے صحیح اور غلط ہونے کا فیصلہ کرے۔

17-069

سمع، بصر، فؤاد

قرآن میں مختلف احکام دیتے ہوئے ارشاد ہوا ہے: اور ایسی چیز کے پیچھے نہ لگو جس کی تم کو خبر نہیں۔ بے شک کان اور آنکھ اور دل سب کی آدمی سے پوچھ ہوگی۔ (بنی اسرائیل ۳۶)

انسان کو تین نہایت خاص صلاحیتیں دی گئی ہیں ـــــــ سمع اور بصر اور فؤاد یعنی سننا اور دیکھنا اور سوچنا۔ یہ تینوں صلاحیتیں ایک اعتبار سے نعمت ہیں اور دوسرے اعتبار سے وہ امتحان کا پرچہ ہیں۔ موجودہ دنیا میں چیزیں اس طرح ملی جلی حالت میں ہیں کہ صحیح رائے قائم کرنا ہمیشہ بے حد نازک کام ہوتا ہے۔ آدمی کسی کے بارہ میں کوئی ایک بات سنتا ہے۔ حالاں کہ اس کے سوا بھی اس کی بہت سی باتیں ہوتی ہیں۔ آدمی کسی معاملہ کے ایک جزء کو دیکھتا ہے، جب کہ اس کے بہت سے اجزاء اس کے سامنے نہیں ہوتے۔ اسی طرح آدمی کے دماغ میں ایک بات آتی ہے، مگر وہ صرف ادھوری بات ہوتی ہے نہ کہ پوری بات۔

ایسی حالت میں آدمی کے اوپر لازم ہے کہ جب بھی وہ کسی کے بارے میں کوئی رائے بنائے تو پوری تحقیق کے بعد بنائے۔ اس کو چاہئے کہ وہ پوری بات سنے۔ وہ معاملے کے ہر پہلو کو دیکھے۔ وہ کوئی رائے قائم کرنے سے پہلے اس کے بارے میں تحقیق کا حق ادا کرے۔ ان شرطوں کی تکمیل کے بغیر جو آدمی محض جزئی یا سرسری علم کی بنا پر ایک رائے قائم کر لے، اس کے لئے اندیشہ ہے کہ وہ خدا کی پکڑ کی زد میں آجائے اور اس کو اپنے کان اور آنکھ اور اپنے ذہن کے غلط استعمال کی سخت سزا بھگتنی پڑے۔

17-070

دنیا اور آخرت

انسان کو دی جانے والی خصوصی نعمتوں کا ذکر کرتے ہوئے قرآن میں ارشاد ہوا ہے: اور

جوشخص اس دنیا میں اندھا رہا وہ آخرت میں بھی اندھا رہے گا اور وہ بہت دور پڑا ہو گا راستے سے۔
(بنی اسرائیل ۷۲)

موجودہ دنیا میں خدائی حقیقتوں کو غیب کی حالت میں رکھا گیا ہے۔ آخرت میں یہ تمام خدائی حقیقتیں کھلے طور پر سامنے آجائیں گی۔ انسان کو اللہ تعالیٰ نے ہر قسم کی اعلیٰ صلاحیتیں دے کر دنیا میں بسایا ہے۔ اب انسان کا امتحان یہ ہے کہ وہ اپنی ان صلاحیتوں کو بھرپور طور پر استعمال کرے اور غیبی حقیقتوں کو دریافت کر کے انھیں اپنی زندگی کا سرمایہ بنائے۔ یہی آدمی کی کامیابی ہے۔ جو آدمی آنکھیں رکھتے ہوئے دنیا میں خدا کے جلووں کو نہ دیکھ سکے، وہ گویا اندھا ہے۔ ایسے لوگ جس طرح دنیا میں اندھے رہے، اسی طرح وہ آخرت میں بھی اندھے رہیں گے۔ وہ آخرت کی نعمتوں میں اپنا حصہ پانے سے ابدی طور پر محروم رہ جائیں گے۔

17-071

ذہنی سانچہ

انسان کی حالت بتاتے ہوئے قرآن میں ارشاد ہوا ہے: کہو کہ ہر ایک اپنے شاکلہ پر عمل کر رہا ہے۔ اب تمہارا رب ہی بہتر جانتا ہے کہ کون زیادہ ٹھیک راستہ پر ہے۔ (بنی اسرائیل ۸۴)

شاکلہ سے مراد ذہنی سانچہ ہے۔ ہر آدمی کے حالات اور رجحانات کے تحت دھیرے دھیرے اس کا ایک خاص ذہنی سانچہ بن جاتا ہے۔ یہ وہی چیز ہے جس کو نفسیات میں کنڈیشننگ کہا جاتا ہے۔ ہر آدمی پیدائشی طور پر صحیح فطری ذہن لے کر پیدا ہوتا ہے اس کے بعد ہر آدمی دھیرے دھیرے کنڈیشننگ تھنکنگ کا کیس بن جاتا ہے۔ وہ اسی کے زیر اثر سوچتا ہے اور اسی کے مطابق اس کا نقطۂ نظر بنتا ہے۔ مگر صحیح نقطۂ نظر وہ ہے جو علم الٰہی کے مطابق صحیح ہو اور غلط وہ ہے جو علم الٰہی کے مطابق غلط ہو۔

یہی وہ مقام ہے جہاں آدمی کا امتحان ہے۔ آدمی کو یہ کرنا ہے کہ اس کے شاکلہ نے اس کا جو ذہنی سانچہ بنا دیا ہے۔ وہ اس سانچہ کو توڑے۔ تاکہ وہ چیزوں کو ویسا ہی دیکھ سکے جیسی کہ وہ ہیں۔

بالفاظِ دیگر وہ چیزوں کو ربانی نگاہ سے دیکھنے لگے ـــــــ جو لوگ اپنے ذہنی خول میں گم ہوں، وہ بھٹکتے ہوئے لوگ ہیں۔ اور جو لوگ اپنے ذہنی خول سے نکل کر خدائی نقطۂ نظر کو پالیں وہی وہ لوگ ہیں جنھوں نے ہدایت پائی۔

17-072

علم قلیل

قرآن میں ارشاد ہوا ہے: اور وہ تم سے روح کے متعلق پوچھتے ہیں۔ کہو کہ روح میرے رب کے حکم سے ہے۔ اور تم کو بہت تھوڑا علم دیا گیا ہے۔ (بنی اسرائیل ۸۵)

اس آیت میں روح سے مراد وحی الٰہی ہے۔ جو لوگ وحی کی حقیقت جاننے کے لئے سوالات کر رہے تھے، ان کو براہِ راست طور پر سوال کا جواب دینے کے بجائے یہ کہا گیا کہ انسان کو صرف علم قلیل (محدود علم) دیا گیا ہے، اس کو علم کثیر (لامحدود علم) نہیں دیا گیا۔ ایسی حالت میں حقیقت پسندی یہ ہے کہ اپنی محدودیت کا اعتراف کرتے ہوئے اجمالی علم پر قناعت کی جائے۔

یہ تصور علم کی کلید ہے۔ موجودہ دنیا میں معرفت یا گہری حقیقت تک وہی انسان پہنچے گا جو اس حقیقت کا اعتراف کرے اور غور وفکر کے عمل کو ممکن دائرہ کے اندر جاری کرے اور اس دائرہ کو توڑ کر ناممکن دائرہ میں داخل نہ ہو جائے۔

17-073

دنیا کی زینت

قرآن میں ارشاد ہوا ہے: جو کچھ زمین پر ہے اس کو ہم نے زمین کی رونق بنایا ہے تاکہ ہم لوگوں کو جانچیں کہ ان میں کون اچھا عمل کرنے والا ہے اور ہم زمین کی تمام چیزوں کو ایک صاف میدان بنادیں گے۔ (الکہف ۷۔۸)

زمین کی سطح پر ہر سال یہ منظر دکھائی دیتا ہے کہ یہاں بارش ہوتی ہے۔ اس کے بعد یہاں مختلف قسم کا سبزہ اور پھول اگتا ہے۔ زمین نہایت خوش نماد کھائی دینے لگتی ہے۔ اس کے بعد موسم

بدلتا ہے گرم ہوائیں چلنے لگتی ہیں۔اس کے بعد سارا منظر بدل جاتا ہے۔جہاں خوش نما سبزہ تھا وہاں خشک مٹی نظر آنے لگتی ہے۔

تمثیل کے روپ میں یہی دنیا کی حقیقت ہے۔دنیا کی چیزیں انسان کو بظاہر نہایت خوش نما دکھائی دیتی ہیں۔وہ ان کی رنگینیوں میں گم ہو جاتا ہے۔لیکن یہ رنگینیاں ہمیشہ باقی رہنے والی نہیں۔یہ رنگینیاں حقیقی نہیں ہیں بلکہ صرف آزمائش کے لئے ہیں۔کامیاب انسان وہ ہے جو بہار اور خزاں کی تمثیل میں دنیا اور آخرت کا نقشہ دیکھ لے۔وہ دنیا کی وقتی رنگینیوں میں گم ہونے کے بجائے آخرت کی حقیقی دنیا کو اپنی توجہات کا مرکز بنائے۔

18-074

مال واولاد

قرآن میں ارشاد ہوا ہے: اور ان کو دنیا کی زندگی کی مثال سناؤ۔ جیسے کہ پانی جس کو ہم نے آسمان سے اتارا۔ پھر اس سے زمین کی نباتات خوب گھنی ہو گئیں پھر وہ ریزہ ریزہ ہو گئیں جس کو ہوائیں اڑاتی پھرتی ہیں۔ اور اللہ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے۔ مال اور اولاد دنیوی زندگی کی رونق ہیں اور باقی رہنے والی نیکیاں تمہارے رب کے نزدیک ثواب کے اعتبار سے بہتر ہیں۔
(الکہف ۴۵۔۴۶)

موجودہ دنیا بعد کو آنے والی آخرت کی تمثیل ہے۔پانی پاکر زمین جب سرسبز ہو جاتی ہے تو بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہمیشہ اسی طرح رہے گی، مگر اس کے بعد موسم بدلتا ہے اور سارا سبزہ سوکھ کر ختم ہو جاتا ہے۔

یہی حال دنیا کی رونقوں کا ہے۔ مال و دولت میں انسان کے لئے بڑی کشش ہے۔اسی طرح اپنی اولاد سے اس کو غیر معمولی دلچسپی ہوتی ہے۔ مگر یہ تمام رونقیں انتہائی عارضی ہیں۔ قیامت بہت جلد ان کو اس طرح ختم کر دے گی کہ ایسا معلوم ہوگا جیسے ان کا کوئی وجود ہی نہ تھا۔

دنیا کی رونقیں ہمیشہ باقی نہیں رہتیں مگر یہاں ایک اور چیز ہے جو ہمیشہ باقی رہنے والی ہے۔

اور وہ انسان کے نیک اعمال ہیں۔ جس طرح زمین میں بیج ڈالنے سے باغ اگتا ہے اسی طرح اللہ کی یاد اور اللہ کی فرماں برداری سے بھی ایک باغ اگتا ہے۔ اس باغ پر کبھی خزاں نہیں آتی۔ مگر دنیوی باغ کے برعکس یہ دوسرا باغ آخرت میں اگتا ہے اور وہیں وہ اپنے اگانے والے کو ملے گا۔

19-075

پیغمبروں کی امت

قرآن میں مختلف پیغمبروں اور ان پر ایمان لانے والوں کا ذکر ہے۔ پھر اس سلسلے میں ارشاد ہوا ہے: یہ وہ لوگ ہیں جن پر اللہ نے پیغمبروں میں سے اپنا فضل فرمایا۔ آدم کی اولاد میں سے اور ان لوگوں میں سے جن کو ہم نے نوح کے ساتھ سوار کیا تھا۔ اور ابراہیم اور اسرائیل کی نسل سے اور ان لوگوں میں سے جن کو ہم نے ہدایت بخشی اور ان کو مقبول بنایا۔ جب ان کو خدائے رحمان کی آیتیں سنائی جاتیں تو وہ سجدہ کرتے ہوئے اور روتے ہوئے گر پڑتے۔ پھر ان کے بعد ایسے ناخلف جانشین ہوئے، جنھوں نے نماز کو کھو دیا اور خواہشوں کے پیچھے پڑ گئے، پس عنقریب وہ اپنی خرابی کو دیکھیں گے، البتہ جس نے توبہ کی اور ایمان لے آیا اور نیک کام کیا تو یہی لوگ جنت میں داخل ہوں گے اور ان کی ذرا بھی حق تلفی نہیں کی جائے گی۔ (مریم ۵۸۔۶۰)

پیغمبر پر ایمان لانے والوں کی پہلی نسل زندہ ایمان کی حامل ہوتی ہے۔ اس پہلی نسل کے افراد کا یہ حال ہوتا ہے کہ وہ خدا کے کلام کو سن کر تڑپ اٹھتے ہیں۔ خدا کا کلام ان کے شعور کو آخری حد تک جگا دیتا ہے۔ خدا سے ان کا تعلق اتنا بڑھا ہوا ہوتا ہے کہ وہ اس کی یاد میں روتے ہیں۔ ان کا سجدہ ان کے لئے خدا سے قربت کے ہم معنی بن جاتا ہے۔ یہی لوگ حقیقتوں میں خدا کا انعام پانے والے لوگ ہیں۔

اس کے بعد ان کی بعد کی نسلوں کا حال بالکل مختلف ہو جاتا ہے۔ اب ان کا ایمان زندہ ایمان نہیں ہوتا بلکہ صرف رسمی ایمان ہوتا ہے۔ ان کی عبادتوں میں روح (اسپرٹ) باقی نہیں رہتی۔ اب ان کا رہنما صرف ان کی خواہشیں ہوتی ہیں جس کے پیچھے وہ اپنی پوری زندگی ڈال دیتے

ہیں۔ خدا کے نزدیک ان کا انجام گمراہوں جیسا ہے خواہ وہ بطور خود اپنے آپ کو ہدایت یاب سمجھتے ہوں۔ اس سے مستثنیٰ صرف وہ لوگ ہیں جو خدا کی طرف لوٹیں اور زندہ ایمان کا ثبوت دے کر دوبارہ پہلی نسل کی مانند ہو جائیں۔

20-076

دعوت پر نصرت

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ جب اللہ نے حضرت موسیٰ کو پیغمبری دی تو اس کے بعد انھوں نے کہا کہ ـــــ اے میرے رب، میرے سینہ کو میرے لئے کھول دے۔ اور میرے کام کو میرے لئے آسان کر دے۔ اور میری زبان کی گرہ کھول دے۔ تاکہ لوگ میری بات سمجھیں۔ اور میرے خاندان سے میرے لئے ایک مددگار بنا دے، ہارون کو جو میرا بھائی ہے۔ اس کے ذریعہ سے میری کمر کو مضبوط کر دے۔ اور اس کو میرے کام میں شریک کر دے تاکہ ہم دونوں کثرت سے تیری پاکی بیان کریں۔ اور کثرت سے تیرا چرچا کریں۔ بے شک تو ہم کو دیکھ رہا ہے۔ فرمایا کہ دے دیا گیا تم کو اے موسیٰ تمہارا سوال۔ (طٰہٰ ۲۵-۳۶)

داعی کے لئے سینہ کا کھلنا یہ ہے کہ حسب موقع اس کے اندر موثر مضامین کا ورود ہو۔ معاملہ کا آسان ہونا یہ ہے کہ مخالفین کبھی دعوت کی راہ بند کرنے میں کامیاب نہ ہو سکیں۔ زبان کی گرہ کھلنا یہ ہے کہ بڑے سے بڑے مجمع میں بلا جھجک دعوت پیش کرنے کا ملکہ پیدا ہو جائے ـــــ حضرت موسیٰ نے جب یہ درخواست کی تو اللہ کی طرف سے یہ جواب آیا: **قال قد اوتیت سؤلك یٰموسٰی** (اے موسیٰ، تم کو تمہارا سوال دے دیا گیا)

قرآن میں یہ واقعہ ماضی کی تاریخ کے طور پر نہیں آیا ہے اور نہ اس کا تعلق صرف ایک خاص شخصیت سے ہے۔ وہ ایک نصیحت ہے اور اس میں ہر سچے داعی کے لئے امید کا ایک پیغام ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آج کا ایک داعی اگر خدا سے ان چیزوں کو مانگے تو آج بھی خدا کی طرف سے آواز آئے گی کہ اے میرے بندے تجھ کو وہ چیز دے دی گئی جس کا تو نے سوال کیا تھا۔

20-077

دعوتی اسلوب

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون کو مصر کے بادشاہ فرعون کی طرف بھیجا تو ان سے فرمایا: تم دونوں فرعون کے پاس جاؤ کہ وہ سرکش ہو گیا ہے۔ پس اس سے نرمی کے ساتھ بات کرنا، شاید وہ نصیحت قبول کرے یا ڈر جائے۔ (طٰہٰ ۴۳۔ ۴۴)

فرعون اپنے زمانہ کا ایک سرکش بادشاہ تھا اس کے باوجود جب اللہ تعالیٰ نے وقت کے نبی کو اپنے پیغام کے ساتھ اس کی طرف بھیجا تو انھیں یہ ہدایت دی کہ تم فرعون سے نرم انداز میں اپنی بات کہنا۔ اس سے معلوم ہوا کہ دعوت میں نرم انداز مطلق طور پر مطلوب ہے۔ مدعو کی طرف سے کوئی بھی سختی یا سرکشی داعی کو یہ حق نہیں دیتی کہ وہ اپنی دعوت میں نرمی اور شفقت کا انداز کھودے۔

دوسری بات یہ کہ مدعو کا اثر لینا یا دعوت کو قبول کرنا اس پر منحصر ہے کہ اس سے نرم اور حکیمانہ انداز میں بات کہی گئی ہو۔ دعوتی کلام کی یہ شرط داعی کی ذمہ داری کو بتاتی ہے۔ گویا کہ داعی اگر نرم انداز اختیار نہ کرے تو اس کی دعوتی ذمہ داری ختم نہ ہو گی۔ ایسا داعی یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں نے مدعو تک اپنا پیغام پہنچا دیا۔ اب یہ اس کا معاملہ ہے کہ وہ مانے یا نہ مانے۔

20-078

قرآن میں بصیرت

قرآن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کرتے ہوئے ارشاد ہوا ہے: پس برتر ہے اللہ، بادشاہ حقیقی، اور تم قرآن کے لینے میں جلدی نہ کرو جب تک اس کی وحی تکمیل کو نہ پہنچ جائے۔ اور کہو کہ اے میرے رب میرا علم زیادہ کردے۔ (طٰہٰ ۱۱۴)

اس آیت میں ربِّ زدنی علماً کی تشریح رب زدنی فہماً سے کی گئی ہے (تفسیر القرطبی) یعنی اے میرے رب میری سمجھ کو زیادہ کردے۔ اس آیت کا پس منظر یہ ہے کہ جب حضرت جبرئیل قرآن کا کوئی حصہ لے کر رسول اللہ کے پاس آتے اور اس کو پڑھتے تو رسول اللہ اس کو

لینے میں جلدی کرتے، اس اندیشہ کی بنا پر کہ کہیں اس کو بھول نہ جائیں۔ اس وقت آپ کو یہ تلقین کی گئی کہ الفاظ قرآن کی حفاظت کا ذمہ تو خود اللہ نے لے رکھا ہے اس لئے وہ کسی حال میں ضائع ہونے والا نہیں۔ تم کو الفاظ کے معانی پر زیادہ توجہ دینا چاہئے اور متن قرآن کے فہم میں اضافہ کی دعا کرتے رہنا چاہئے۔

اس ہدایت کا تعلق صرف پیغمبر سے نہیں ہے بلکہ آپ کی امت سے بھی ہے۔ پوری امت کو یہ جاننا چاہئے کہ الفاظ قرآن یا متن قرآن کی حفاظت تو بہر حال ہو کر رہے گی۔ کیوں کہ اس کا ذمہ اللہ نے خود لے لیا ہے۔ اہل ایمان کو سب سے زیادہ توجہ جس چیز پر دینا ہے وہ قرآن کے معانی میں فہم و بصیرت حاصل کرنا ہے اور اس میں مسلسل اضافہ کرتے رہنا ہے۔ کیوں کہ قرآن کا فہم یا اس میں گہری بصیرت کسی آدمی کی صرف اپنی کوشش سے ملے گی۔ وہ اپنے آپ کسی کو حاصل ہونے والی نہیں۔

اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ امت میں تحفیظ القرآن کے مدارس سے بھی زیادہ ضروری ہے کہ ان کے درمیان تفہیم القرآن کے ادارے قائم کئے جائیں۔ قرآن کا حفظ بھی اگرچہ ضروری ہے مگر اس سے بھی زیادہ ضروری یہ ہے کہ لوگوں کو قرآن کا فہم حاصل ہو، وہ قرآن کے معانی میں زیادہ سے زیادہ بصیرت اور تفقہ کے مالک بنیں۔

قرآن میں دوسرے مقام پر اسی طرح کے پس منظر میں کہا گیا ہے کہ: **ان علینا جمعه** (القیامہ ۱۷) اور یہاں فرمایا: **قل رب زدنی علماً** (طٰہٰ ۱۱۴) دونوں آیتوں کو ملایا جائے تو اس کا مطلب بنتا ہے کہ قرآن کو جمع کرنا اور اس کو محفوظ رکھنا اللہ کی ذمہ داری ہے، اور قرآن میں فہم و بصیرت حاصل کرنا اور اس میں مسلسل اضافہ کرتے رہنا انسان کی ذمہ داری۔

20-079

رزقِ رب

قرآن میں ارشاد ہوا ہے: اور ان چیزوں کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھو جن کو ہم نے

ان کے کچھ گروہوں کو ان کی آزمائش کے لئے انھیں دے رکھا ہے۔ اور تمہارے رب کا رزق زیادہ بہتر ہے اور باقی رہنے والا ہے (طٰہٰ ۱۳۱)

اس آیت کا خطاب بظاہر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے مگر اپنی حقیقت کے اعتبار سے وہ ایک عمومی ہدایت ہے اور اس کا تعلق تمام اہلِ ایمان سے ہے۔ اس آیت میں جو بات کہی گئی ہے اس میں تمام اہل ایمان کے لئے ایک اہم رہنمائی ہے، خواہ وہ کسی بھی دور یا کسی بھی نسل سے تعلق رکھتے ہوں۔

ایک آدمی جب پوری سنجیدگی کے ساتھ ایمان اور دعوت کی زندگی اختیار کرتا ہے تو اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اس کی زندگی مشکلات کی اور تنگی کی زندگی بن جاتی ہے۔ اس کے برعکس جو لوگ ایمان اور دعوت سے بے پرواہو کر اپنی زندگی بنائیں وہ عام طور پر خوش حال اور مطمئن نظر آتے ہیں۔ دونوں گروہوں کے درمیان یہ فرق دراصل ان کے طرز زندگی کی قیمت ہے۔ مؤمن اور داعی ایک بااصول انسان ہوتا ہے۔ وہ ایک بااصول زندگی گزارتا ہے۔ اس کے مقابلے میں غیر مومن اور غیر داعی کی زندگی ایک بے اصول زندگی ہوتی ہے۔ یہی فرق دونوں کی زندگی میں فرق پیدا کر دیتا ہے۔ ایک کو اصول پسندی کی قیمت ملتی ہے اور دوسرے کو بے اصولی کا طریقہ اختیار کرنے کی قیمت۔

مومن اور داعی کو اگر دنیا کی ظاہری رونقیں نہ ملی ہوں تو اس کو اس پر غم نہیں کرنا چاہئے۔ اس لئے کہ اس کو عین اسی وقت اس سے بھی زیادہ بڑی ایک چیز ملی ہوئی ہوتی ہے، اور وہ قرآن کے مطابق، رزق رب (طٰہٰ ۱۳۱) ہے۔ رزق رب سے کیا مراد ہے، اس سے مراد وہ ربانی احساسات ہیں جو اللہ کی توفیق سے ایسے آدمی کو ملتے ہیں۔ مشکلات و مسائل اس کے اندر عجز پیدا کر کے اس کو اللہ سے جوڑتے ہیں۔ مادی راحتوں کی کمی اس کے لئے جنت کی یاد کا سبب بن جاتی ہے۔ لوگوں کی مخالفتیں اس کے اندر رجوع الی اللہ کا جذبہ ابھارتی ہیں۔ زندگی کے تلخ تجربات اس کی روحانیت کو مسلسل بیدار کرتے رہتے ہیں۔ دنیوی ساز و سامان کی کمی اس کو زیادہ سے زیادہ خدا سے

قریب کرنے کا سبب بن جاتی ہے۔

21-080

کائنات کی تخلیق

قرآن میں ارشاد ہوا ہے: کیا انکار کرنے والوں نے نہیں دیکھا کہ آسمان اور زمین دونوں بند تھے پھر ہم نے ان کو کھول دیا۔ اور ہم نے پانی سے ہر جاندار چیز کو بنایا۔ کیا پھر بھی وہ ایمان نہیں لاتے۔ (الانبیاء ۳۰)

رتق کے معنی کسی چیز کا منھ بند (منضم الاجزاء) ہونا ہے اور فتق کا مطلب اس کا کھل جانا ہے۔ غالباً اس سے زمین و آسمان کی وہ ابتدائی صورت مراد ہے جس کو موجودہ زمانہ میں بگ بینگ نظریہ کہا جاتا ہے۔ جدید سائنسی تحقیق کے مطابق زمین و آسمان کا تمام مادہ ابتداءً ایک بہت بڑے گولے (سپر ایٹم) کی صورت میں تھا۔ معلوم طبیعاتی قوانین کے مطابق اس وقت اس کے تمام اجزاء اپنے اندرونی مرکز کی طرف کھنچ رہے تھے۔ اور انتہائی شدت کے ساتھ باہم جڑے ہوئے تھے۔ اس کے بعد اس گولے کے اندر ایک دھماکہ ہوا اور اس کے اجزاء اچانک بیرونی سمت میں پھیلنا شروع ہوئے۔ اس طرح بالآخر وہ وسیع کائنات بنی جو آج ہمارے سامنے موجود ہے۔

ابتدائی مادی گولے (سپر ایٹم) میں یہ غیر معمولی واقعہ بیرونی مداخلت کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ اس طرح آغاز کائنات کی یہ تاریخ واضح طور پر ایک ایسی ہستی کو ثابت کرتی ہے جو کائنات کے باہر اپنا مستقل وجود رکھتی ہے اور جو اپنی ذاتی قوت سے کائنات کے اوپر اثر انداز ہوتی ہے۔ رتق اور فتق کے اس عمل کے دوران ایک اور انتہائی غیر معمولی واقعہ ہوا۔ وہ یہ کہ وسیع کائنات میں زمین جیسا ایک استثنائی کرہ وجود میں آیا اور پھر اس کرہ کے اوپر انتہائی استثنائی طور پر پانی جیسا سیال مادہ بہت بڑی مقدار میں پھیل گیا جو زندگی کے لئے انتہائی ضروری ہے۔ ہماری دنیا میں ہر جاندار چیز سب سے زیادہ جس چیز سے مرکب ہوتی ہے وہ پانی ہے، پانی نہ ہو تو زندگی کا خاتمہ ہو جائے۔ یہ پانی

ہماری زمین کے سوا کہیں اور موجود نہیں۔ وسیع کائنات میں استثنائی طور پر صرف ایک مقام پر پانی کا پایا جانا واضح طور پر ''خصوصی تخلیق'' کا پتہ دیتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ کائنات کا ایک خالق ہے جس نے اپنے باشعور منصوبہ کے تحت اسے ایک وقت خاص میں پیدا کیا۔

22-081

ہدایت پانے والے

قرآن میں ارشاد ہوا ہے: بے شک جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کیا، اللہ ان کو ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی۔ ان کو وہاں سونے کے کنگن اور موتی پہنائے جائیں گے۔ اور وہاں ان کی پوشاک ریشم ہوگی۔ اور ان کو پاکیزہ قول کی ہدایت بخشی گئی تھی۔ اور ان کو خدائے حمید کا راستہ دکھایا گیا تھا۔ (الحج ۲۳۔۲۴)

حق کا تعارف کسی آدمی کو اصلاً الفاظ کے ذریعہ ہوتا ہے۔ الفاظ میں مختلف تشریح اور تعبیر کی اتنی زیادہ گنجائش ہے کہ صرف وہی آدمی اس سے رہنمائی لے سکتا ہے جو اس معاملہ میں آخری حد تک سنجیدہ ہو۔ اسی لئے قرآن میں بتایا گیا ہے کہ خدا کی کتاب اگرچہ حق ہے مگر وہ انھیں لوگوں کے لئے ہدایت بنتی ہے جو کھلے ذہن کے ساتھ اس سے ہدایت لینے کے حریص ہوں۔

مزید یہ کہ اس دنیا میں ہر طرف پر فریب الفاظ کا جال بچھا ہوا ہے۔ یہاں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ حق سے پھرے ہوئے لوگ غلبہ حاصل کر لیتے ہیں۔ ایسے ماحول میں ایمان کی صداقت کو پہچاننا بلاشبہہ سخت مشکل کام ہے۔ اور اس سے بھی زیادہ مشکل کام یہ ہے کہ ایمان کے اس راستہ پر عملاً اپنے آپ کو ڈال دیا جائے۔

یہ وہ خوش نصیب لوگ ہیں جن کو اقوال کے پر شور ہنگاموں میں قول طیب کو پانے کی توفیق ملی۔ جنھوں نے راستوں کے ہجوم میں صراط حمید کو دیکھا اور اس کو پہچان لیا۔ جو لوگ دنیا میں اس عظیم لیاقت کا ثبوت دیں وہ انسانیت کے سب سے زیادہ قیمتی لوگ ہیں یہی لوگ اس قابل ہیں کہ انھیں جنت کے ابدی باغوں میں بسایا جائے۔

22-082

قربانی کی حقیقت

قرآن میں قربانی کے احکام بتاتے ہوئے کہا گیا ہے کہ: اور اللہ کو قربانی کے ان جانوروں کا نہ گوشت پہنچتا ہے اور نہ ان کا خون بلکہ اللہ کو صرف تمہارا تقویٰ پہنچتا ہے۔ اس طرح اللہ نے ان کو تمہارے لئے مسخر کر دیا ہے، تاکہ تم اللہ کی بخشی ہوئی ہدایات پر اس کی بڑائی بیان کرو اور نیکی کرنے والوں کو خوش خبری دے دو۔ (الحج ۳۷)

قربانی کا فعل جانور پر کیا جاتا ہے مگر آیت میں بتایا گیا ہے کہ اللہ کو جو چیز مطلوب ہے وہ حقیقۃً جانور کی قربانی نہیں ہے بلکہ خود انسان کی قربانی ہے۔ جانور کو ذبح کرنے والا آدمی دراصل عمل کی زبان میں یہ کہہ رہا ہوتا ہے کہ میں نے اپنے آپ کو تیرے مشن کے لئے قربانی کی حد تک وقف کر دیا۔ تو میرے اس ارادہ کو قبول فرما۔

قربانی کا طریقہ اس لئے مقرر نہیں کیا گیا ہے کہ خدا کو گوشت اور خون کی ضرورت ہے۔ قربانی تو صرف ایک علامتی فعل ہے۔ جانور کی قربانی اس انسان کی ایک ظاہری تصویر ہے جو اپنے آپ کو اللہ کے لئے ذبح کر چکا ہے۔ یہ دراصل خود اپنا ذبیحہ ہے جو جانور کے ذبیحہ کی صورت میں ممثل ہوتا ہے۔ خوش قسمت ہیں وہ لوگ جن کے لئے جانور کی قربانی خود اپنی قربانی کے ہم معنیٰ بن جائے۔

22-083

دفاعی جنگ

قرآن میں اہل ایمان کو جنگ کی اجازت دیتے ہوئے ارشاد ہوا ہے: (لڑنے کی اجازت دے دی گئی ان لوگوں کو جن سے لڑائی کی جارہی ہے اس وجہ سے کہ ان پر ظلم کیا گیا ہے اور بے شک اللہ ان کی مدد پر قادر ہے۔ وہ لوگ جو اپنے گھروں سے بے وجہ نکالے گئے۔ صرف اس لئے کہ وہ کہتے ہیں کہ ہمارا رب اللہ ہے۔ اور اگر اللہ لوگوں کو ایک دوسرے کے ذریعہ دفع نہ کرتا رہے

تو خانقاہیں اور گرجا اور عبادت خانے اور مسجدیں جن میں اللہ کا نام کثرت سے لیا جاتا ہے ڈھادئے جاتے۔ اور اللہ ضرور اس کی مدد کرے گا جو اللہ کی مدد کرے۔ بے شک اللہ زبردست ہے، زور والا ہے۔ (الحج ۳۹۔۴۰)

قرآن کی یہ آیت اور اس طرح کی دوسری آیتیں (مثلاً البقرہ ۱۹۰) اس بات کا واضح ثبوت ہیں کہ اسلام میں صرف اپنے دفاع کے لئے جنگ کی اجازت ہے، اسلام میں جارحانہ جنگ کی بالکل اجازت نہیں۔ مزید یہ کہ کوئی قوم اگر جارحیت کرے تب بھی فوراً اس سے جنگ نہیں چھیڑ دی جائے گی۔ بلکہ ہر ممکن کوشش کے ذریعہ یہ تدبیر کی جائے گی کہ جنگ ٹل جائے اور لڑائی کی نوبت نہ آئے۔ تاہم اگر فریق ثانی آخری حد تک جنگ پر تل جائے تو آخری چارۂ کار کے طور پر اس سے جنگ کی جائے گی۔

مزید یہ کہ دفاعی جنگ بھی صرف فریق ثانی کی فوج سے لڑی جائے گی۔ عام شہریوں سے ہرگز کوئی تعرض نہیں کیا جائے گا۔ اسی طرح یہ جنگ صرف اس وقت تک کی جائے گی جب تک وہ بالکل ضروری ہے، جنگ کو انتقام تک لے جانا اسلام میں جائز نہیں۔ (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو راقم الحروف کی کتاب، فکر اسلامی اور مطالعۂ حدیث)

23-084

فلاح پانے والے

قرآن میں ارشاد ہوا ہے: یقیناً فلاح پائی ایمان والوں نے جو اپنی نماز میں جھکنے والے ہیں اور جو لغو باتوں سے اعراض کرتے ہیں۔ اور جو زکوٰۃ ادا کرنے والے ہیں اور جو اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرنے والے ہیں، سوا اپنی بیویوں کے اور ان عورتوں کے جو ان کی ملک یمین میں ہوں کہ ان پر وہ قابل ملامت نہیں۔ البتہ جو اس کے علاوہ چاہیں تو وہی زیادتی کرنے والے ہیں۔ اور جو اپنی امانتوں اور اپنے عہد کا خیال رکھنے والے ہیں۔ اور جو اپنی نمازوں کی حفاظت کرتے ہیں۔ یہی لوگ وارث ہونے والے ہیں جو فردوس کی وراثت پائیں گے۔ وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ (المومنون ۱۔۱۱)

خدا کی اس دنیا میں کامیابی صرف اس شخص کے لئے ہے جو صاحب ایمان ہو۔ جو کسی اور والا نہ ہو کر ایک اللہ والا بن جائے۔ جس کی زندگی اندر سے باہر تک ایمان میں ڈھل گئی ہو۔

جب کسی شخص کو ایمان ملتا ہے تو یہ سادہ سی بات نہیں ہوتی۔ یہ اس کی زندگی میں ایک انقلاب آنے کے ہم معنی ہوتا ہے۔ اب وہ اللہ کی عبادت کرنے والا اور اس کے آگے جھکنے والا بن جاتا ہے۔ اس کی سنجیدگی اتنی بڑھ جاتی ہے کہ بے فائدہ مشاغل میں وقت ضائع کرنا اس کو ہلاکت معلوم ہونے لگتا ہے۔ وہ اپنی کمائی کا ایک حصہ خدا کے نام پر نکالتا ہے۔ اور اس سے ضرورت مندوں کی مدد کرتا ہے۔ وہ اپنی شہوانی خواہشات کو کنٹرول میں رکھنے والا بن جاتا ہے۔ اور اس کو انھیں حدود کے اندر استعمال کرتا ہے جو خدا نے اس کے لئے مقرر کر دی ہیں۔ وہ دنیا میں ایک ذمہ دار آدمی کی طرح زندگی گزارتا ہے۔ دوسرے کی امانت میں وہ کبھی خیانت نہیں کرتا۔ کسی سے جب وہ کوئی عہد کر لیتا ہے تو وہ کبھی اس کے خلاف نہیں جاتا۔ جن لوگوں کے اندر یہ خصوصیات ہوں وہ اللہ کے مطلوب بندے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کے لئے خدا نے جنت الفردوس کی معیاری دنیا تیار کر رکھی ہے۔ موت کے بعد وہ اس کی فضاؤں میں داخل کر دئے جائیں گے تاکہ ابدی طور پر وہ اس کے اندر عیش کرتے رہیں۔

23-085

خدائی رحمت میں حصہ پانے والے

قرآن میں ارشاد ہوا ہے: کیا وہ سمجھتے ہیں کہ ہم ان کو جو مال اور اولاد دئے جا رہے ہیں تو ہم ان کو فائدہ پہنچانے میں سرگرم ہیں بلکہ وہ بات نہیں سمجھتے۔ بے شک جو لوگ اپنے رب کی ہیبت سے ڈرتے ہیں۔ اور جو لوگ اپنے رب کی آیتوں پر یقین رکھتے ہیں۔ اور جو لوگ اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتے۔ اور جو لوگ دیتے ہیں جو کچھ دیتے ہیں اور ان کے دل کانپتے ہیں کہ وہ اپنے رب کی طرف لوٹنے والے ہیں۔ یہ لوگ بھلائیوں کی راہ میں سبقت کر رہے ہیں اور وہ ان پر پہنچنے والے ہیں سب سے آگے۔ (المؤمنون ۵۵-۶۱)

ایک آدمی کو دنیا کی ترقی اور مادی ساز و سامان مل رہا ہو تو وہ سمجھ لیتا ہے کہ وہ ایک کامیاب انسان ہے اور یہ خدا کی رحمتیں ہیں جو اس کے اوپر نازل ہو رہی ہیں۔ مگر مادی ترقیاں کسی کے لئے اس بات کی پہچان نہیں ہیں کہ وہ خدا کا محبوب بندہ ہے اور خدا اس پر اپنی نعمتوں کی بارش کر رہا ہے۔ مادی ساز و سامان اس دنیا میں امتحان کے لئے ہوتا ہے نہ کہ انعام کے لئے۔

کسی آدمی کو اس دنیا میں خدا کی نعمتیں ملنے کی پہچان یہ ہے کہ ــــــ دنیا کے واقعات اس کو خدا کی یاد دلانے والے بن جائیں۔ دنیا میں زندگی گزارتے ہوئے اس پر خدا سے خوف اور محبت کے تجربات گزرتے رہیں۔ دنیا اس کے لئے ایسی نشانیوں کا مجموعہ بن جائے جس میں اس کو خدا کے جلوے دکھائی دینے لگیں۔ وہ خدا کو ایک ایسی ہستی کے روپ میں دریافت کر لے جو ہر قسم کے شرک سے بالاتر ہو۔ اس کو دنیا میں جو کچھ ملے اس کو وہ ذاتی لیاقت کا نتیجہ سمجھنے کے بجائے براہِ راست خدا کا عطیہ سمجھے۔ اس کا یہ احساس اتنا زیادہ بڑھا ہوا ہو کہ جب وہ اپنی کمائی میں سے کسی ضرورت مند کو کچھ دے تو وہ اس احساس سے کانپ رہا ہو کہ یہ میں اپنا مال نہیں دے رہا ہوں بلکہ میں خدا کی ایک امانت کو خدا کے بندے تک پہنچا رہا ہوں۔ یہ حقیقت ہر لمحہ اس کے ذہن میں تازہ، رہتی ہو کہ وہ آخر کار مرنے والا ہے اور خدا کے یہاں حساب کتاب کے لئے حاضر ہونے والا ہے۔

جو لوگ اس احساسات کے ساتھ دنیا میں جئیں وہی خدا کے پسندیدہ لوگ ہیں۔ ان کی یہ حالت اس بات کی پہچان ہے کہ انھیں صبح و شام خدا کی رحمتیں پہنچ رہی ہیں۔ وہ دنیا میں بھی کامیاب ہیں اور آخرت میں بھی کامیاب۔

23-086

ایک معاشرتی حکم

مدینہ میں حضرت عائشہ صدیقہ پر کچھ لوگوں نے ایک بے ہودہ الزام لگایا اور اس کی خوب اشاعت کی۔ اس الزام تراشی کے تقریباً ایک مہینہ بعد حضرت عائشہ کی برأت میں سورہ النور اتری۔ اس میں اللہ نے فرمایا: جن لوگوں نے یہ طوفان برپا کیا وہ تمہارے اندر ہی کی ایک جماعت

ہے۔ تم اس کو اپنے حق میں برا نہ سمجھو بلکہ یہ تمہارے لئے بہتر ہے۔ ان میں سے ہر آدمی کے لئے وہ ہے جتنا اس نے گناہ کمایا۔ اور جس نے اس میں سب سے بڑا حصہ لیا اس کے لئے عذاب ہے۔ جب تم لوگوں نے اس کو سنا تو مسلمان مردوں اور مسلمان عورتوں نے ایک دوسرے کی بابت نیک گمان کیوں نہ کیا اور کیوں نہ کہا کہ یہ کھلا ہوا بہتان ہے۔ (النور ۱۱۔۱۲)

حضرت عائشہ صدیقہ پر جب الزام لگایا تو پھیلانے والوں نے اس کو اتنا زیادہ پھیلایا کہ سارے شہر میں اس کا چرچا ہو گیا۔ حضرت عائشہ خود اس معاملے میں بالکل خاموش تھیں۔ انھوں نے اس کے بارے میں کوئی بیان نہیں دیا۔ حتی کہ جب ان سے پوچھا گیا تو اس کے بعد بھی انھوں نے اپنی زبان سے یہ کہنے سے انکار کر دیا کہ: **واللہ ما قارفت۔**

اب واحد صورت یہ تھی کہ قرآن میں اس کے بارے میں حکم اترے۔ مگر جب قرآن میں سورہ النور اتری تو اس میں بھی اس قسم کے تردیدی الفاظ نہیں تھے کہ: مار قارفت عائشہ۔ اس کے بجائے اس جھوٹ کی تردید کے لئے صرف یہ کہا گیا کہ "جو لوگ یہ افک (بے ہودہ بات) لائے ہیں۔ دوسری طرف اہل ایمان سے کہا گیا کہ تم نے جب اس بے ہودہ بات کو سنا تو تم نے یہ کیوں نہ کہہ دیا کہ: **سبحنك هذا بهتان عظيم** (النور ۱۶)

اس سے یہ اہم مسئلہ معلوم ہوتا ہے کہ اس طرح کی الزام تراشی کے معاملہ میں مسلم معاشرہ کا طریقہ کیسا ہونا چاہئے۔ ایک طرف اس کو ایسا ہونا چاہئے کہ جب کوئی غیر سنجیدہ آدمی محض قیاس کی بنیاد پر کسی کے خلاف سنگین الزام لگائے تو سننے والوں کو چاہئے کہ وہ سنتے ہی فوراً کہہ دیں کہ یہ ایک بہتان ہے، اور کسی کو حق نہیں کہ وہ حقیقی شرعی ثبوت کے بغیر کسی کے خلاف اس قسم کی سنگین الزام تراشی کرے۔ دوسری طرف جس شخص کے اوپر اس قسم کے بے ہودہ الزام لگایا گیا ہے اس سے یہ تقاضا نہیں کرنا چاہئے کہ وہ برہنہ الفاظ میں اس کی تردید کرے۔ اس کا یہ کہنا کہ یہ ایک بے ہودہ بات ہے، یہی کافی ہے کہ اس کو اس معاملے میں پوری طرح بری الذمہ مان لیا جائے۔

جو لوگ اس قسم کی بے ہودہ باتیں اپنی زبان سے نکالیں اور جو لوگ اس کو سن کر اسے پھیلانا شروع کردیں وہ قرآن کے الفاظ میں اشاعت فاحشہ کے مجرم ہیں۔ ان کے لئے خدا نے دنیا اور آخرت میں دردناک عذاب کا اعلان کیا ہے۔ (النور ۱۹)

24-087

زمین میں خلافت

قرآن میں ارشاد ہوا ہے: اللہ نے وعدہ فرمایا ہے تم میں سے ان لوگوں کے ساتھ جو ایمان لائیں اور نیک عمل کریں کہ وہ ان کو زمین میں اقتدار دے گا جیسا کہ ان سے پہلے لوگوں کو اقتدار دیا تھا۔ اور ان کے لئے ان کے دین کو جمادے گا جس کو ان کے لئے پسند کیا ہے۔ اور ان کی خوف کی حالت کے بعد اس کو امن سے بدل دے گا۔ وہ صرف میری عبادت کریں گے اور کسی چیز کو میرا شریک نہ بنائیں گے۔ اور جو اس کے بعد انکار کرے تو ایسے ہی لوگ نافرمان ہیں۔ (النور ۵۵)

آیت میں اس استخلاف (خلیفہ بنانے) کا لفظ ہے۔ خلیفہ کے معنی عربی زبان میں جانشین یا بعد کو آنے والے کے ہیں۔ استخلاف یا خلیفہ بنانا یہ ہے کہ ایک قوم کے بعد دوسری قوم کو اس کی جگہ غلبہ اور استحکام عطا کیا جائے ــــــ غلبہ دراصل خدائی امتحان کا ایک پرچہ ہے۔ خدا ایک کے بعد ایک، ہر قوم کو زمین میں غلبہ دیتا ہے۔ اور اس طرح ہر ایک کو جانچتا ہے۔ سچے اہل ایمان کے لئے یہ غلبہ امتحان کے ساتھ ایک انعام بھی ہے۔

اس آیت سے مزید یہ معلوم ہوتا ہے کہ غلبہ اور اقتدار اہل ایمان کے عمل کا نشانہ نہیں۔ وہ ایک خدائی انعام ہے جو ایمان اور عمل صالح کی زندگی اختیار کرنے کے بعد کی مومنین کی جماعت کو دیا جاتا ہے۔

اس غلبہ کا مقصد یہ ہے کہ اہل ایمان کو زمین میں استحکام عطا کیا جائے۔ ان کو یہ موقع دیا جائے کہ وہ دشمنان حق کے اندیشوں سے مامون ہو کر رہ سکیں۔ وہ آزادانہ طور پر خدا کی عبادت کریں۔ اور صرف ایک خدا کے بندے بن کر زندگی گزاریں۔ اہل ایمان کے غلبہ کی یہ حالت

اس وقت تک باقی رہے گی جب تک وہ خدا کے شکر کرنے والے بنے رہیں۔ اور تقویٰ کی کیفیت کو نہ کھوئیں۔

25-088

عالمی کتاب

قرآن میں ارشاد ہوا ہے: بڑی بابرکت ہے وہ ذات جس نے اپنے بندے پر فرقان اتارا تاکہ وہ تمام جہان والوں کے لئے ڈرانے والا ہو۔ وہ جس کے لئے آسمانوں اور زمین کی بادشاہی ہے۔ اور اس نے کوئی بیٹا نہیں بنایا اور بادشاہی میں کوئی اس کا شریک نہیں اور اس نے ہر چیز کو پیدا کیا اور اس کا ایک اندازہ مقرر کیا۔ (الفرقان ۱۔۲)

قرآن کے مختلف بیانات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب اپنے تمام اقوامِ عالم کے لئے بھیجی گئی۔ یہی بات دوسرے مقام پر پیغمبر اسلام کی نسبت سے اس طرح کہی گئی ہے: اور ہم نے تم کو تمام انسانوں کے لئے خوش خبری دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے مگر اکثر لوگ نہیں جانتے۔ (سبا ۲۸)

قرآن اصلاً عربی زبان میں ہے۔ وہ ابتداءً عرب میں اترا مگر جہاں تک اس کے پیغام کا تعلق ہے، وہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے پوری طرح عالمی اور آفاقی ہے۔ اس کا خطاب تمام اقوام عالم سے ہے نہ کہ کسی مخصوص قوم سے۔

قرآن کا بنیادی پیغام یہ ہے کہ خدا ایک ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ کوئی وقتی اور مقامی چیز نہیں۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کا تعلق تمام انسانوں سے ہے۔ قرآن میں یہ خبر دی گئی ہے کہ انسان مر کر ختم نہیں ہو جاتا بلکہ وہ حساب کتاب کے لئے آخرت کی عدالت میں حاضر کیا جاتا ہے۔ یہ بھی ایک ایسی حقیقت ہے جو تمام انسانوں سے تعلق رکھتی ہے۔ اسی طرح قرآن میں بتایا گیا ہے کہ لین دین میں کامل انصاف کا طریقہ اختیار کرو۔ یہ بھی ایک ایسی تعلیم ہے جس کا تعلق تمام انسانوں سے ہے۔ اسی طرح قرآن میں اعلان کیا گیا ہے کہ تمام انسان ایک ہی انسان اول کی اولاد ہیں۔

اس لئے تمام انسان آپس میں بھائی بھائی ہیں، ان میں اگر کوئی فرق ہے تو وہ نسل کی بنیاد پر نہیں ہے بلکہ تقویٰ کی بنیاد پر ہے۔ یہ بھی ایک ایسی تعلیم ہے جو تمام انسانوں سے تعلق رکھتی ہے، وغیرہ۔

اسی طرح قرآن کی تمام تعلیمات عالمی اور آفاقی حیثیت رکھتی ہیں۔ وہ ماضی سے لے کر مستقبل تک تمام انسانوں کے لئے رہنمائی ہیں۔

25-089

خواہش پرستی

قرآن میں ارشاد ہوا ہے: کیا تم نے اس شخص کو دیکھا جس نے اپنی خواہش کو اپنا معبود بنا رکھا ہے۔ پس کیا تم اس کا ذمہ لے سکتے ہو۔ یا تم خیال کرتے ہو کہ ان میں سے اکثر سنتے اور سمجھتے ہیں۔ وہ تو محض جانوروں کی طرح ہیں بلکہ وہ ان سے بھی زیادہ بے راہ ہیں۔ (الفرقان ۴۳۔۴۴)

کسی کو معبود بنانا یہ ہے کہ اس کو اپنی زندگی میں سب سے زیادہ اونچا درجہ دے دیا جائے۔ ہر دوسری باتیں غیر اہم ہوں اور وہ چیز سب سے زیادہ اہم۔ آدمی ہر دوسری بات کو نظر انداز کر سکتا ہو مگر اس چیز کو وہ نظر انداز نہ کر سکے۔ اس چیز کی بڑائی اس کے نزدیک اتنی زیادہ ہو کہ بقیہ سب کچھ اس کے نزدیک ہیچ ہو جائے۔ جب کوئی شخص اپنی خواہش کو اس قسم کا اونچا درجہ دے دے تو گویا کہ اس نے اس چیز کو اپنا معبود بنا لیا۔

اللہ نے انسان کو پیدا کیا۔ وہی انسان کی تمام ضرورتیں پوری کرتا ہے۔ انسان کو اس دنیا میں جو کچھ ملتا ہے وہ اللہ سے ملتا ہے۔ اللہ کے سوا کسی اور سے اس کو کچھ ملنے والا نہیں۔ اللہ تعالیٰ کی اس حیثیت کا تقاضا ہے کہ وہ صرف اللہ کو اپنا سب کچھ سمجھے۔ وہ اللہ سے سب سے زیادہ ڈرے اور اسی سے سب سے زیادہ محبت کرے۔ اس کی زندگی میں سب سے بڑا درجہ صرف ایک اللہ کا ہو، اس کے سوا تمام چیزیں اس کی نظر میں چھوٹی ہو جائیں۔ اسی کا نام توحید ہے اور توحید کے بغیر کسی انسان کی نجات ممکن نہیں۔

جو لوگ اپنی خواہشات کو اپنا رہنما بنا لیں وہ گویا حیوان کے مانند ہیں۔ حیوان کو حق اور ناحق

کی تمیز نہیں ہوتی۔ وہ صرف اپنی خواہش کو جانتا ہے اور اس کے پیچھے چلتا ہے۔ یہی حال اگر انسان کا ہو جائے تو انسان اور حیوان میں کیا فرق بلکہ یہ کہنا صحیح ہو گا کہ ایسا انسان جانور سے بھی زیادہ بد تر ہے کیوں کہ جانور پھر بھی اپنی تخلیق پر قائم ہے، جب کہ ایسا انسان گویا اپنے تخلیقی نقشے سے ہٹ گیا۔

25-090

رحمان کے بندے

قرآن میں اہل جنت کا تذکرہ کرتے ہوئے ارشاد ہوا ہے: اور رحمٰن کے بندے وہ ہیں جو زمین پر عاجزی کے ساتھ چلتے ہیں۔ اور جب جاہل لوگ ان سے بات کرتے ہیں تو وہ کہہ دیتے ہیں کہ تم کو سلام۔ اور جو اپنے رب کے آگے سجدہ اور قیام میں راتیں گزارتے ہیں۔ اور جو کہتے ہیں کہ اے ہمارے رب جہنم کے عذاب کو ہم سے دور رکھ۔ بے شک اس کا عذاب پوری تباہی ہے۔ بے شک وہ برا ٹھکانہ ہے اور برا مقام ہے۔ اور وہ لوگ کہ جب وہ خرچ کرتے ہیں تو نہ فضول خرچی کرتے ہیں اور نہ تنگی کرتے ہیں۔ اور ان کا خرچ اس کے درمیان اعتدال پر ہوتا ہے۔ اور جو اللہ کے سوا کسی دوسرے معبود کو نہیں پکارتے۔ اور وہ اللہ کی حرام کی ہوئی کسی جان کو قتل نہیں کرتے مگر حق پر۔ اور وہ بدکاری نہیں کرتے۔ اور جو شخص ایسے کام کرے گا تو وہ سزا سے دوچار ہو گا۔ قیامت کے دن اس کا عذاب بڑھتا چلا جائے گا۔ اور وہ اس میں ہمیشہ ذلیل ہو کر رہے گا۔ مگر جو شخص توبہ کرے اور ایمان لائے اور نیک کام کرے تو اللہ ایسے لوگوں کی برائیوں کو بھلائیوں سے بدل دے گا۔ اور اللہ بخشنے والا اور مہربان ہے۔ اور جو شخص توبہ کرے اور نیک کام کرے تو وہ در حقیقت اللہ کی طرف رجوع کر رہا ہے۔ اور جو لوگ جھوٹے کام میں شامل نہیں ہوتے۔ اور جب کسی بیہودہ چیز سے ان کا گزر ہوتا ہے تو وہ سنجیدگی کے ساتھ گزر جاتے ہیں۔ اور وہ ایسے ہیں کہ جب ان کو ان کے رب کی آیتوں کے ذریعہ نصیحت کی جاتی ہے تو وہ ان پر بہرے اور اندھے ہو کر نہیں گرتے۔ اور جو کہتے ہیں کہ اے ہمارے رب، ہم کو ہماری بیوی اور ہماری اولاد کی طرف سے آنکھوں کی ٹھنڈک عطا فرما اور ہم کو پرہیزگاروں کا امام بنا۔ یہ لوگ

ہیں کہ ان کو بالا خانے ملیں گے اس لئے کہ انھوں نے صبر کیا۔ اور ان میں ان کا استقبال تحیت اور سلام کے ساتھ ہو گا۔ وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے۔ وہ خوب جگہ ہے ٹھہرنے کی اور خوب جگہ ہے رہنے کی۔ (الفرقان ٦٣۔٧٦)

قرآن کی ان آیتوں میں بتایا گیا ہے کہ وہ کون لوگ ہیں جن کو آخرت کی ابدی جنتوں میں جگہ ملے گی۔ یہاں چند آیتوں میں ایسے لوگوں کی بنیادی صفتوں کو بتا دیا گیا ہے۔ ان آیتوں پر غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ ان لوگوں کا معاملہ اپنے رب کے ساتھ کس طرح کا ہوتا ہے اور ان انسانوں کے ساتھ ان کا سلوک کیسا ہوتا ہے جن کے درمیان وہ زندگی گزار رہے ہوں۔

ان آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ جنتی اوصاف ان لوگوں میں پیدا ہوتے ہیں جو دنیا میں اس احساس کے ساتھ رہیں کہ وہ خدائے رحمان ورحیم کے بندے ہیں۔ ان کی حیثیت خدا کے مقابلے میں عبد کی ہے۔ وہ آزاد نہیں ہیں بلکہ وہ ہر لمحہ خدا کے ماتحت ہیں۔

دنیا میں خدا کا بندہ بن کر رہنے کی قیمت صرف ایک ہے، اور وہ صبر ہے۔ نفس کے مقابلے میں صبر، شیطان کے مقابلے میں صبر اور منفی جذبات کے مقابلے میں صبر۔ جو آدمی صبر کی یہ قیمت دینے کے لئے تیار ہو وہی موجودہ دنیا میں خدا پرستانہ زندگی پر قائم رہے گا۔ جنت کی قیمت صبر ہے۔ صبر کے بغیر کوئی شخص جنت والے عمل نہیں کر سکتا، اس لئے صبر کے بغیر کوئی شخص جنت میں داخل بھی نہیں ہو سکتا۔

حقیقی توبہ خود ایک عمل ہے، جو گناہ آدمی کے اندر حقیقی توبہ کی کیفیت پیدا کرے وہ گناہ اپنے نتیجہ کے اعتبار سے ایسا ہے کہ اس کو نیکی کے خانہ میں لکھ دیا جائے۔

25-091

برائی کے بدلے نیکی

قرآن میں بعض گناہوں کا اور ان کے اخروی انجام کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد ہوا ہے: مگر جو شخص توبہ کرے اور ایمان لائے اور نیک کام کرے تو اللہ ایسے لوگوں کی برائیوں کو بھلائیوں

سے بدل دے گا۔ اور اللہ بخشنے والا اور مہربان ہے۔ اور جو شخص توبہ کرے اور نیک کام کرے تو وہ درحقیقت اللہ کی طرف رجوع کر رہا ہے۔ (الفرقان ۷۰۔۷۱)

اس آیت میں ایک غیر معمولی انعام کا ذکر ہے۔ اس میں صرف یہ نہیں کہا گیا ہے کہ اللہ ایسے لوگوں کی گناہوں کو معاف کر دے گا۔ بلکہ اس کے بجائے یہ فرمایا کہ اللہ ان کی برائیوں کو نیکیوں میں تبدیل کر دے گا یعنی ان سے جو برائی سرزد ہوئی وہ سادہ طور پر صرف معاف نہ ہوگی بلکہ وہ برائی بجائے خود نیکی بن جائے گی۔ یہی بات حدیث میں ان الفاظ میں آئی ہے: "ان السیئات تبدل بحسنات" (تفسیر القرطبی ۱۳/۷۸)

یہاں دراصل مخصوص قرآنی اسلوب کے مطابق، بندے کی بات کو خدا کی طرف منسوب کر کے کہا گیا ہے۔ مذکورہ قسم کے اہل ایمان دراصل اپنی توبہ کے ذریعہ اپنی سیئات کو حسنات میں بدل چکے ہوں گے۔ اس کے بعد اللہ ان کی اس "تبدیلی" کو قبول کر کے خود بھی ان کی سیئات کو ان کی حسنات کے خانے میں درج کر دے گا۔ یہ معاملہ اللہ کی خصوصی توفیق سے ہوگا۔ اس لئے اس کو اللہ کی طرف منسوب فرمایا۔

یہ خدا کا وہ بندہ ہے جس سے بشری تقاضے کے تحت کوئی گناہ ہو گیا، اس کے بعد وہ احساسِ گناہ سے تڑپ اٹھا۔ اس کے اندر نہایت گہرائی کے ساتھ توبہ اور رجوع الی اللہ کی کیفیت پیدا ہو گئی۔ وہ اس طرح خدا سے معافی مانگنے لگا کہ ایک طرف اس کی لرزتی ہوئی زبان پر اعتراف کے کلمات تھے اور دوسری طرف اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب جاری تھا۔ اس کا یہ داخلی تجربہ اتنا شدید تھا کہ ایسا محسوس ہونے لگا گویا کہ وہ خدا کو اپنے سامنے دیکھ رہا ہے اور کسی درمیانی واسطے کے بغیر براہ راست طور پر اس سے مخاطب ہے۔

اس بندۂ خدا سے اگرچہ بظاہر ایک گناہ سرزد ہوا تھا۔ مگر اس کے بعد اس کی جو کیفیت ہوئی وہ اعلیٰ ترین ایمانی کیفیت تھی۔ اس کے گنہگار جسم کو اس کے مقدس آنسوؤں نے دھو کر پہلے سے بھی زیادہ پاک کر دیا۔ اس کی شخصیت اندر سے لے کر باہر تک ایک ربانی شخصیت بن گئی۔ وہ خدا

سے اتنا زیادہ قریب ہو گیا جتنا اس سے پہلے وہ کبھی نہیں ہوا تھا۔ تقویٰ خشوع، انابت، تضرع اور اخبات جیسی اعلیٰ ایمانی صفات اس کے اندر کمال درجہ میں پیدا ہو گئیں۔ وہ اس نادر روحانی تجربہ سے دوچار ہوا جس کو حدیث میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: تعبد الله کانك تراه (صحیح البخاری) یعنی اللہ کی عبادت اس طرح کرو جیسے کہ تم اس کو دیکھ رہے ہو۔

مذکورہ بندے سے جب بشری تقاضے کے تحت گناہ سرزد ہوا تو اپنے ظاہر کے اعتبار سے وہ ایک گناہ ہی تھا۔ مگر اس گناہ کے بعد اس کا جو نتیجہ اس کی شخصیت میں ظاہر ہوا وہ بجائے خود سب سے بڑی نیکی تھا۔ اس طرح بندے نے اگر چہ بظاہر ایک گناہ کیا تھا مگر اس کے بعد اس کی توبۂ نصوح نے اس گناہ کو بدل کر اس کو ان احوال تک پہنچا دیا جو نیکی کی اعلیٰ ترین قسم سے تعلق رکھتے ہیں۔ جب ایسا ہوا تو اللہ نے اس بندے کی ''تبدیلی'' کو حسنِ قبول عطا کرتے ہوئے یہ عنایت فرمائی کہ اس کی برائی کو نیکی کے خانے میں درج کر دیا۔

26-092

ایمان کی طاقت

قرآن کی سورہ الشعراء میں موسیٰ اور فرعون کا قصہ بیان ہوا ہے۔ فرعون نے حضرت موسیٰ کا مقابلہ کرنے کے لئے مصر کے جادوگروں کو بلایا۔ جب تمام لوگ میدان میں اکٹھا ہوئے تو قرآن کے مطابق، جادوگروں اور فرعون کے درمیان یہ مکالمہ ہوا: پھر جب جادوگر آئے تو انھوں نے فرعون سے کہا، کیا ہمارے لئے کوئی انعام ہے اگر ہم غالب رہے۔ فرعون نے کہا ہاں، اور تم اس صورت میں مقرب لوگوں میں شامل ہو جاؤ گے۔ (الشعراء ۴۱۔۴۲)

یہ جادوگر جو آغاز میں مصر کے بادشاہ فرعون کے ساتھ اس قسم کی خوشامدانہ باتیں کر رہے تھے وہ بعد کو بالکل بدل گئے۔ مقابلے میں جب فرعون کو شکست ہوئی اور جادوگروں کے جادو کو حضرت موسیٰ کے عصا نے نگل لیا تو جادوگروں کا وہ حال ہوا جس کو قرآن میں اس طرح بیان کیا گیا ہے: پھر جادوگر سجدے میں گر پڑے۔ انھوں نے کہا ہم ایمان لائے رب العالمین پر جو

موسیٰ اور ہارون کا رب ہے۔ (الشعراء ۴۶۔۴۸)

جادوگروں کا یہ حال دیکھ کر فرعون سخت غصہ ہو گیا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ قرآن کے الفاظ میں یہ تھا: فرعون نے کہا، تم نے اس کو مان لیا اس سے پہلے کہ میں تم کو اجازت دوں۔ بے شک وہی تمہارا استاد ہے جس نے تم کو جادو سکھایا ہے۔ پس اب تم کو معلوم ہو جائے گا۔ میں تمہارے ایک طرف کے ہاتھ اور دوسری طرف کے پاؤں کاٹوں گا اور تم سب کو سولی پر چڑھا دوں گا۔ (الشعراء ۴۹)

اس کے بعد جادوگروں کا ردعمل اس سے بالکل مختلف تھا جس کا اظہار انھوں نے شروع میں فرعون کے ساتھ کیا تھا۔ قرآن کا بیان ہے کہ: جادوگروں نے فرعون کو جواب دیتے ہوئے کہا کہ کچھ حرج نہیں، ہم اپنے مالک کے پاس پہنچ جائیں گے۔ ہم امید رکھتے ہیں کہ ہمارا رب ہماری خطاؤں کو معاف کر دے گا۔ اس لئے کہ ہم پہلے ایمان لانے والے بنے (الشعراء ۵۰۔۵۱)

جادوگروں کے اندر یہ فرق کیسے پیدا ہوا۔ وہی جادوگر جو مقابلہ سے پہلے فرعون سے خوشامد کی باتیں کر رہے تھے۔ انہوں نے مقابلہ کے بعد جرأت اور قربانی کی زبان بولنا شروع کر دیا۔ یہ فرق ایمان کے نتیجہ میں پیدا ہوا۔ مقابلہ سے پہلے جادوگر عام انسان تھے جن کو حق کی معرفت نہیں ملی تھی۔ مگر مقابلہ کے بعد انھیں حق کی معرفت حاصل ہو گئی۔ یہی وہ چیز ہے جس نے ان کے کردار میں فرق پیدا کر دیا۔ حق کی معرفت کسی انسان کے لئے سب سے بڑا تجربہ ہے۔ حق کی معرفت ایک عام انسان کو غیر معمولی انسان بنا دیتی ہے۔ اس کے بعد آدمی اس قابل ہو جاتا ہے کہ وہ ہیرو والا کردار ادا کرے، وہ بڑی سے بڑی قربانی کا بھی یقین اور حوصلہ کے ساتھ استقبال کر سکے۔

26-093

شاعر کا مقام

عرب کے لوگ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو شاعر کہتے تھے۔ اس کی تردید کرتے ہوئے قرآن میں ارشاد ہوا ہے: اور شاعروں کے پیچھے بے راہ لوگ چلتے ہیں۔ کیا تم نہیں دیکھتے

کہ وہ ہر وادی میں بھٹکتے ہیں اور وہ کہتے ہیں جو وہ کرتے نہیں۔ مگر جو لوگ ایمان لائے اور اچھے کام کئے اور انھوں نے اللہ کو بہت یاد کیا اور انھوں نے بدلہ لیا بعد اس کے کہ ان پر ظلم ہوا۔ اور ظلم کرنے والوں کو جلد معلوم ہو جائے گا کہ ان کو کیسی جگہ لوٹ کر جانا ہے۔ (الشعراء ۲۲۴۔۲۲۷)

قرآن کی یہ آیت اصلاً مخالفین رسول کے پروپیگنڈے کے جواب میں آئی ہے۔ تاہم اس سے یہ اصول معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی دعوت اور انسانی اصلاح کا کام شعر و شاعری کے ذریعہ نہیں ہو سکتا۔ شعر و شاعری کا طریقہ کسی سنجیدہ مشن کے لئے ہرگز مفید نہیں ہے۔ کوئی شاعر اگر اپنے شاعرانہ کلام کے ذریعہ کچھ لوگوں کو اکٹھا کر لے تو یقینی طور پر وہ غیر سنجیدہ لوگ ہوں گے۔ ایسے لوگوں کے ذریعہ تعمیر و اصلاح کا کوئی گہرا کام نہیں کیا جا سکتا۔

27-094

سیاسی ٹکراؤ نہیں

قرآن میں حضرت سلیمان اور ملکۂ سبا کا قصہ بیان ہوا ہے۔ حضرت سلیمان نے ملکۂ سبا کے پاس ایک خط بھیج کر اس سے اطاعت کا مطالبہ کیا۔ ملکۂ سبا نے اپنے درباریوں سے مشورہ کیا۔ درباریوں نے اطاعت قبول نہ کرنے کا مشورہ دیا۔ ملکۂ سبا نے اس پر خطر رائے سے اختلاف کیا: اس نے کہا کہ بادشاہ لوگ جب کسی بستی میں داخل ہوتے ہیں تو وہ اس کو خراب کر دیتے ہیں اور وہ اس کے عزت والوں کو ذلیل کر دیتے ہیں اور یہی یہ لوگ کریں گے۔ (النمل ۳۴)

ملکۂ سبا کے سامنے جب یہ مسئلہ آیا تو اس نے اس معاملہ کو خالص حقیقت پسندانہ انداز سے دیکھا۔ اس نے یہ رائے قائم کی کہ اگر ہم سلیمان کی طاقت سے ٹکرائیں تو زیادہ امکان یہ ہے کہ ہم ہاریں گے اور پھر ہمارے ساتھ وہی کیا جائے گا جو ہر غالب قوم مغلوب قوم کے ساتھ کرتی ہے۔ اس کے برعکس اگر ہم اطاعت قبول کر لیں تو ہم تباہی سے بچ جائیں گے۔

ملکۂ سبا نے اپنی اس گفتگو میں حضرت سلیمان کے بارہ میں کہا کہ: **وکذالك یفعلون** (النمل ۳۴) یعنی سلیمان بھی ایسا ہی کریں گے۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے یہ تردید نہیں فرمائی کہ سلیمان

تو پیغمبر ہیں وہ ایسا کرنے والے نہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ سیاسی ٹکراؤ کا اپنا ایک مزاج ہے۔ اس میں کوئی استثناء نہیں۔ ایسی حالت میں ایسا کرنا درست نہیں کہ کوئی جماعت طاقتور حکمراں سے ٹکرا جائے۔ اگر اس نے ایسا کیا تو پھر وہی ہوگا جس کی طرف ملکۂ سبا نے اپنے مذکورہ جواب میں اشارہ کیا ہے۔ ایسے گروہ کو جاننا چاہئے کہ سیاسی ٹکراؤ کے بعد جب وہ حکمراں کے ظلم کی شکایت کرے گا تو ایسی شکایت کی قیمت نہ بندوں کی نظر میں ہوگی نہ خدا کی نظر میں۔

28-095

غلطی کی معافی

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ایک واقعہ قرآن میں اس طرح بیان ہوا ہے: اور شہر میں موسیٰ ایسے وقت داخل ہوئے جب کہ شہر والے غفلت میں تھے تو اس نے وہاں دو آدمیوں کو لڑتے ہوئے پایا۔ ایک موسیٰ کی اپنی قوم کا تھا اور دوسرا دشمنوں میں سے تھا۔ تو جو اس کی قوم میں سے تھا اس نے اس کے خلاف مدد طلب کی جو اس کے دشمنوں میں سے تھا۔ پس موسیٰ نے اس کو گھونسا مارا پھر اس کا کام تمام کر دیا۔ موسیٰ نے کہا کہ یہ شیطان کے کام سے ہے۔ بے شک وہ دشمن ہے کھلا گمراہ کرنے والا۔ اس نے کہا کہ اے میرے رب، میں نے اپنی جان پر ظلم کیا ہے۔ پس تو مجھ کو بخش دے تو خدا نے اس کو بخش دیا۔ بے شک وہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔ (القصص ۱۵۔۱۶)

قرآن کے اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر غلطی خدا کے یہاں معاف ہو سکتی ہے۔ کسی آدمی سے کوئی غلطی ہو جائے اس کے بعد وہ فوراً چونک اٹھے۔ وہ اپنی غلطی کا کھلا اعتراف کرتے ہوئے دل سے معافی کا طلب گار ہو۔ وہ غلطی کرنے کے بعد اس کو چھپانے یا اس کا جواز تلاش کرنے کی کوشش نہ کرے تو خدا اس کی غلطی کو معاف کر دے گا، خواہ بظاہر وہ کتنی ہی بڑی کیوں نہ ہو۔ غلطی کرنے کے بعد غلطی کا شدید اعتراف بھی بجائے خود ایک نیکی ہے۔ ایسی نیکی برائی کو ڈھانپ لیتی ہے۔ غلطی کرنے کے بعد سرکشی کرنا جرم میں اضافہ کرتا ہے اور غلطی کے بعد شرمسار ہونا غلطی کو مٹا دیتا ہے۔